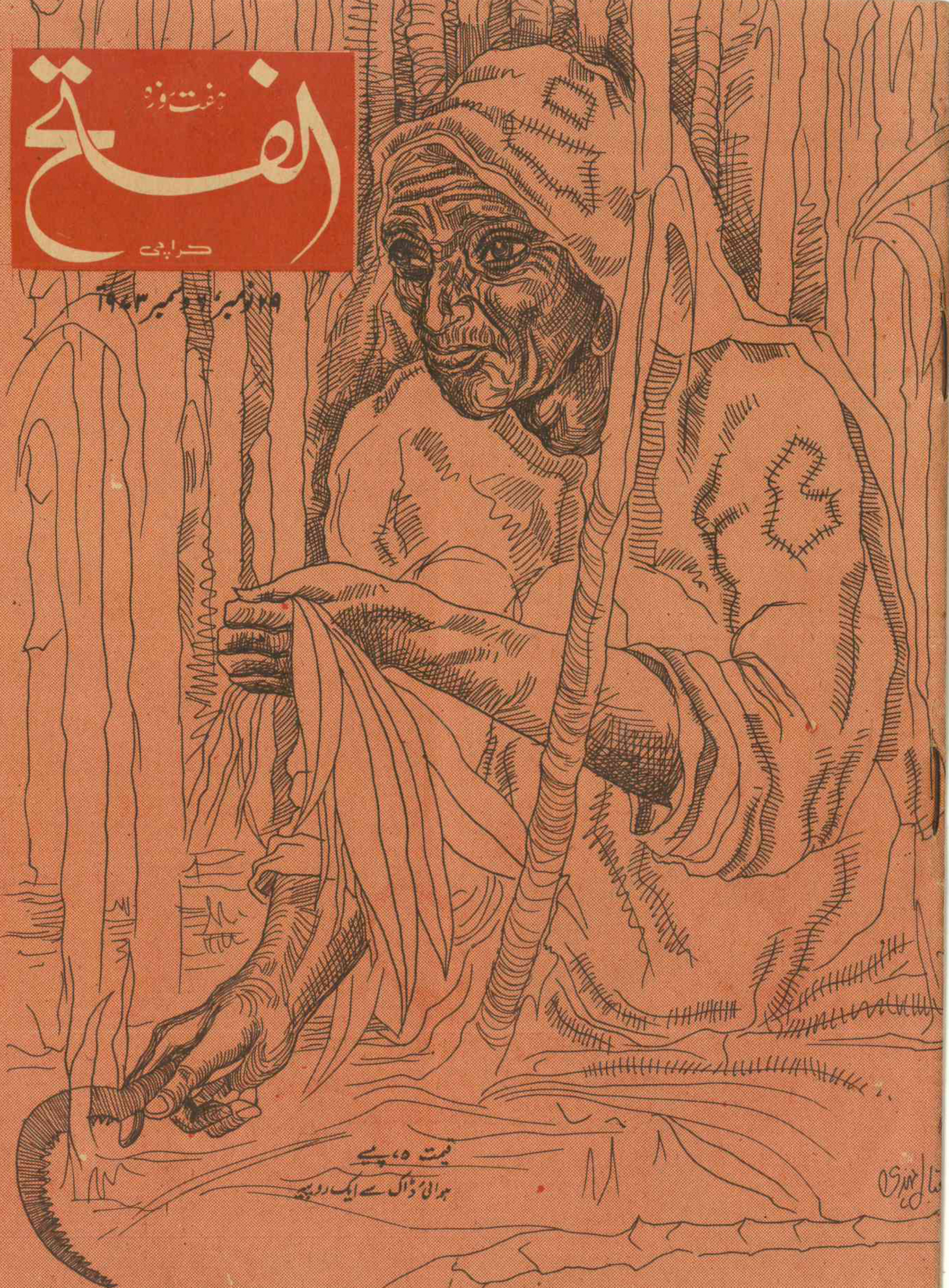
ہفت روزہ

الفتح

کراچی

۲۹ نومبر، ۶ دسمبر ۱۹۷۳



قیمت ۵۰ پیسے

ہوائی ڈاک سے ایک روپیہ

مشرق وسطیٰ کے محاذ پر

احمد رئیس

شام سے
تا بہ صحرائے سینائی
سب ایک ہیں
ایک آواز ہے
ایک للکار ہے
ایک ہی جہد و پے کار ہے
ایک یلغار ہے
ایسی یلغار کہ
آج دایان کے
حوصلے پست ہیں
اور امریکہ
حیرت زدہ ہے کہ اس کے
عزائم کی دیوار
مسمار ہونے کو ہے
اک نئی صبح
بیدار ہونے کو ہے!
—— آج سارا عرب
ایک پرچم تلے
امن کے واسطے
جنگ لڑنے میں مصروف ہے
لوگ کہتے ہیں
یہ آخری جنگ ہے
کاش! ایسا ہی ہو
تاکہ اِس خطۂ نور کا
ہر مکاں
پیار کی روشنی سے منوّر ہے!!

غزل

حزیں لدھیانوی

لرزاں فضا، رِدائے فلک تار تار ہے
مشتِ غبار آج ستاروں کے پار ہے

جبر و ستم سے عظمتِ آدم نہ مٹ سکی
رسوا جہاں میں تمکنتِ شہریار ہے

چاہت، خلوص، پیار کا بندہ ہوں دوستو
ہر چند سرکشوں میں مرا بھی شمار ہے

کھاتا ہوں پتھروں کے ثمر پیڑ پیڑ سے
موسم کوئی ہو میرے جنوں پہ بہار ہے

کیسے ہوا کے ساتھ قلانچیں بھرے گلاب
پیکر لہو لہان ہے، چہرہ فگار ہے

شاید کہ اہلِ زر کا جہنم بھرا نہیں
"ہل من مزید" اہلِ ہوس کی پکار ہے

دنیا کو پھونک دیں نہ کہیں جنگ کے شرار
اے امن کی پھوار، ترا انتظار ہے

لایا ہے پوسٹ مین غزل کا معاوضہ
یہ دس کا نوٹ، آج مجھے دس ہزار ہے!

کیسے حزیں کا شہرِ نگاراں میں ہو گذر
حائل قدم قدم پہ غمِ روزگار ہے

۲۹ نومبر، ۶ دسمبر ۱۹۷۳ء
قیمت ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے ایک روپیہ

ایڈیٹر
وہاب صدیقی

خدا کی بستی کے مظلوم
عوام کا ترجمان

اداریہ

الفتح

جلد : ۳۰ شمارہ : ۴۷-۴۸

خاص مضامین

سرورق
اقبال مہدی

تزئین
ذیب

فون ۴۱۲۲۷۴

مخالفت برائے مخالفت

پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ ۲۶ سال کے دوران عوامی جمہوریت تو کجا مغربی جمہوریت بھی کامیاب نہیں ہو سکی، پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں کی شہادت سے جمہوریت کے قتل کی تاریخ شروع ہوتی ہے، اس کے بعد نوکر شاہی اور فوجی جنتا مختلف روپ بہروپ میں حکومت کرتی رہی، اس دور کو بجا طور پر آمریت کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس عرصے میں عوام پر جو گزری، اس کے ردِ عمل میں ۱۹۶۸ء کے عظیم عوامی ابھار نے جنم لیا۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے ایوب آمریت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دی۔

یادش بخیر، اسی عظیم عوامی ابھار کے دوران بڑے بڑے جغادری سیاستدان اپنے اپنے بلوں میں سے باہر نکلے، جمہوری مجلس عمل قائم کی، گلوں میں ہار ڈلوانے کا اہتمام کیا اور جہاں کہیں جلوس و جلسے کی خبر سنی، پہنچ گئے، ان "شرفا" کے اس عمل کا مقصد یہ تھا کہ دراصل یہ سب کچھ ان کے اشاروں اور رہنمائی میں ہو رہا ہے' ایوب خاں نے انہیں بلاوا بھیج دیا کہ آؤ' سودا کرو، چنانچہ سودے بازی شروع ہو گئی۔

کچھ دو اور کچھ لو، گول میز کانفرنس میں زیر بحث تھا مگر عوام ایوب خاں کو کوئی

ارشاد راؤ پبلشر نے حقانی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۸ ڈی۔ ترسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا

رعایت دینے پر آمادہ نہ تھے، ہر چند کہ یہ نام نہاد رہنما ایوب خاں سے تھوڑی بہت خیرات ملنے پر ہی اپنے اپنے بلوں میں جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے، اس موقع پر عوام نے ثابت کر دیا تھا کہ انہیں سودے باز رہنماؤں پر ہرگز اعتماد نہیں بلکہ وہ ایسے شخص پر بھروسہ کریں گے جو جمہوریت کی بحالی کے لئے ان کا ساتھ دے۔ یہ اعزاز پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو کو ملا اور عوام نے انتخابات کے دوران ان کی پارٹی کو بھاری اکثریت میں ووٹ دیئے۔

سودے باز رہنما اس پر بوکھلا گئے۔ وہ مغربی پاکستان میں بھٹو اور مشرقی پاکستان میں مجیب کی واضح اکثریت میں کامیابی سے پریشان ضرور ہوئے مگر انہوں نے انتہائی دیدہ دلیری سے اپنے دوسرے پروگرام پر عمل شروع کر دیا جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو کالعدم قرار دے دیا گیا اور مغربی پاکستان میں نیپ پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مشرقی پاکستان میں دوبارہ انتخابات ہوئے جس میں پیپلز پارٹی نے بھی حصہ لیا لیکن اس بندربانٹ کی چیمپئن جماعت اسلامی تھی، نتیجہ جنگ مشرقی پاکستان کی مکمل علیحدگی اور نوے ہزار فوجیوں اور شہریوں کی نظر بندی میں نکلا۔ ملک کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔

ان حالات میں پاکستان پیپلز پارٹی کو اقتدار ملا۔ مغربی پاکستان کے عوام کو بچے کھچے پاکستان کی حزب اقتدار اور حزب اختلاف سے یہ امید تھی کہ وہ قوم کا وقار بحال کرانے میں موثر اور فعال کردار ادا کریں گے، حزب اقتدار کے سامنے زیادہ مشکل کام تھا، اسے ورثے میں پرانا نظام اور اس کے کل پرزے ملے، دوسرے جو لوگ منتخب ہوتے تھے ان کا اپنا طبقاتی کردار تھا، ان میں وہ لوگ بھی تھے جو کبھی ایوب خاں کے دست راست تھے اور وہ بھی تھے جو پاکستان پیپلز پارٹی کی مقبولیت کو بھانپتے ہوئے شامل ہو گئے تھے، لہذا پیپلز پارٹی کو نئے پاکستان کی تعمیر کی جو ذمہ داریاں ملی تھیں، اسے پورا کرنے میں اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

اس کے مقابلے میں حزب اختلاف کی ذمہ داریاں بھی اس قدر تھیں، اسے ملک کی تعمیر نو میں جہاں حزب اقتدار کا محاسبہ کرنا تھا وہاں خود ایک فریق کی حیثیت سے ملک کے اندرونی استحکام کو تقویت پہنچانا تھا۔ لیکن اس میں اسے افسوسناک حد تک ناکامی ہوئی، اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ حزب اختلاف نے روایتی انداز میں یہ سمجھ لیا کہ اس کا کام حزب اقتدار کو اقتدار سے محروم کرنا ہے اور اس کے لئے اسے جو بھی حربے استعمال کرنے پڑیں، وہ کرے گی۔ اس کے سامنے کوئی کام نہ تھا لہذا مخالفت برائے مخالفت کی پالیسی پر گامزن رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حزب اختلاف، حزب اقتدار کا محاسبہ بھی نہ کر سکی اور حزب اقتدار میں ان لوگوں کو کھلی چھٹی مل گئی جو اس نظام کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

حزب اختلاف کی اس غلط حکمت عملی کے ثبوت کے طور پر کراچی میں حالیہ تعلیمی اداروں میں بے چینی کے واقعات کو پیش کیا جا سکتا ہے، ہمارا یہ موقف نہیں ہے کہ بے چینی کا جواز موجود نہیں تھا یا حکومت نے جو

باقی صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ فرمائیے

برزنیف کے دورہ بھارت کے ساتھ پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا

تیل کا ہتھیار موثر ثابت ہو رہا ہے۔ معاشی جنگ میں عربوں کو کامیابی ہو رہی ہے۔ امریکہ، یورپ اور جاپان کی صنعتی پیداوار اور صنعتوں پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اس لئے وہ عربوں کو سجدہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ سب سے برا احوال جاپان کا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ضرورت کا ۸۰ فیصد تیل مشرق وسطیٰ سے حاصل کرتا ہے۔ تیل کی سپلائی میں تخفیف کے سبب جاپان کی آٹو موبائیل، فولاد سیمنٹ اور بجلی کے سامان کی صنعتوں میں تیل کے استعمال میں دس فی صد کمی کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے جاپان کی صنعتی ترقی اور پیداوار بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔

چنانچہ حکومت جاپان نے ۲۲ر نومبر ۱۹۷۳ء کو واضح طور پر عربوں کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے اسرائیل کو دھمکی دی کہ اگر اسرائیل نے ۱۹۶۷ء کے مقبوضہ علاقے خالی نہ کئے تو جاپان اسرائیل سے تعلقات پر نظر ثانی کرے گا۔ یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ اگلے سال فلسطینی پناہ گزینوں کی امداد کے لئے جاپان اپنا حصہ ۱۱ لاکھ ڈالر سے بڑھا کر ۵۰ لاکھ ڈالر کر دے گا۔ جاپان کے نائب وزیر خارجہ مسٹر شنسا کو ہوگن کا خیال ہے کہ "جاپان کو اس نئی پالیسی کے سبب جو یورپ کی مشترکہ منڈی کے مقابلے میں کہیں زیادہ عربوں کی حمایت میں ہے۔ تیل کی سپلائی میں تخفیف سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے گا"

معاہدہ نیٹو کے رکن ممالک اور جاپان، وائٹ ہاؤس پر بھرپور زور ڈال رہے ہیں۔ کہ وہ اپنے ناجائز اولاد اسرائیل سے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر ۲۴۲ پر مکمل عمل درآمد کرائے۔ اس قرارداد میں اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ وہ ۱۹۶۷ء کے تمام مقبوضہ علاقے خالی کر دے۔ لیکن وائٹ ہاؤس کے ارباب اقتدار دو کرسیوں پر سوار ہونے کی وجہ سے کوئی واضح فیصلہ کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ اگر وہ جاپان کی طرح مکمل طور پر عربوں کی حمایت کرتے ہیں تو وہ وال اسٹریٹ کے ان اجارہ دار یہودی سرمایہ داروں کی حمایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ جنہوں نے انہیں اقتدار کی کرسی تک پہنچایا ہے۔ اور اگر وہ ہمیشہ کی طرح اسرائیل نواز پالیسی پر گامزن رہتے ہیں تو یورپ ان کی گرفت سے

احوال واقعی

واقف حال

تیل کے ہتھیار کی ضرب کاری سے امریکہ بلبلا اٹھا



Cummings—Sunday Express, London



عرب ممالک کے خلاف

براہ راست فوجی اقدام

امریکہ کے لئے موت کا

پھندہ بن جائے گا

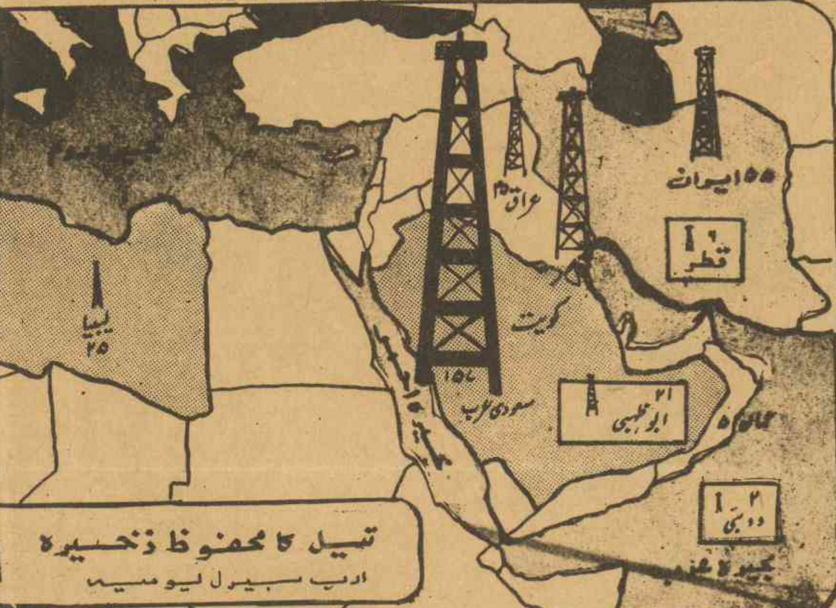


نکل جاتا ہے۔ معاہدہ نیٹو کا قصہ تمام ہو جاتا ہے اس سنگین صورت حال سے نمٹنے کے لئے وال اسٹریٹ کے اجارہ دار سرمایہ دار، فوجی کارروائی کا حل پیش کر رہے ہیں۔ ہفت روزہ "نیوز ویک" نے اپنی تازہ اشاعت میں اس خدشہ کا اظہار کیا ہے کہ اگر عرب ممالک بدستور تیل کی سپلائی میں کمی کر کے مغرب پر دباؤ ڈالتے رہے۔ تو ایک نئی جنگ کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لکھتا ہے کہ "ماضی میں جب مصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لیا تھا تو اس کا نتیجہ ۱۹۵۶ء میں اینگلو فرانس حملہ کی صورت میں برآمد ہوا" ادھر ۲۲ نومبر کو امریکہ کے وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کینسنگر نے بھی فوجی اقدام کی دھمکی دے دی ہے انہوں نے کہا "اگر عرب ملکوں نے تیل کی فراہمی پر پابندی برقرار رکھی تو امریکہ جوابی کارروائی کرے گا"

امریکہ کی ایک دھمکی کے باوجود تا دم تحریر عرب ممالک اپنے موقف پر قائم ہیں۔ لیبیا کے کرنل قذافی نے دھمکی دی ہے کہ "ہم سیمسن کی طرح فالفین سمیت مندر کو تباہ کر دیں گے، ہم تمہاری صنعت کو نیست و نابود کر دیں گے۔ . . . ہم، دنیائے عرب سے ہونیوالی تمہاری تجارت کو تباہ و برباد کر دیں گے"، سعودی عرب کے شاہ فیصل نے بھی واضح طور پر کہہ رہا ہے کہ "جب تک اسرائیل تمام عرب مقبوضہ علاقوں کو خالی، فلسطینیوں کے حق خود اختیاری کے اصول اور بیت المقدس کی عرب حیثیت کو تسلیم نہیں کرے گا، اس وقت تک سعودی عرب تیل کو بطور ہتھیار استعمال کرتا رہے گا"

سعودی عرب کے وزیر تیل شیخ احمد ذکی یمنی نے ۲۳ نومبر کو ڈاکٹر ہنری کینسگر کی دھمکی کے جواب میں کہا کہ "اگر امریکہ نے فوجی مداخلت کی تو سعودی عرب تیل کے کچھ کنوؤں کو تباہ کر دے گا، سعودی عرب میں تیل کے کنوؤں کے کچھ علاقے بہت زیادہ حساس ہیں جنہیں امریکی فوجی مداخلت کی صورت میں فوری طور پر اڑا دیا جائے گا۔ اگر امریکہ، یورپ یا جاپان نے تیل کی پابندی پر عربوں کے خلاف کوئی اقدام کیا تو سعودی عرب تیل کی پیداوار میں ۸۰ فی صد کمی کر دے گا"

اگرچہ امریکہ کے وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کینسگر نے جوابی کارروائی کی دھمکی دے دی ہے۔ لیکن اس بات کے امکانات نہیں ہیں کہ امریکہ براہ راست تیل پیدا کرنے والے ممالک پر حملہ کرے۔ امریکہ کے سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ براہ راست فوجی مداخلت سے امریکہ کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو جائے گی، اور وہ پوری دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ امریکہ کے براہ راست فوجی اقدام سے سوویت یونین کو بھی مسلح مداخلت کا جواز مل جائے گا۔ بعض سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ امریکہ براہ راست فوجی مداخلت کی بجائے خلیج فارس میں واقع اپنے کسی دوست ملک سے تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک پر حملہ کروا دے گا، یا اپنے رسوائے زمانہ سی آئی اے کے ذریعے خلیج فارس کی عرب ریاستوں کی موجودہ حکومتوں کا تختہ الٹ دے گا اور جس طرح انڈونیشیا میں سوہارتو ٹولے کا سربراہ لایا گیا اسی طرح خلیج کی عرب ریاستوں میں اپنے حواریوں اور حاشیہ...



تیل کا محفوظ ذخیرہ

ادب سیرل لیومیہ

برداروں کو برسرِ اقتدار لائے گا تاکہ وہ تیل کی سپلائی بحال کردیں۔

برطانیہ کے ہفت روزہ "اکانومسٹ" کا خیال ہے کہ اس بات کا امکان ہے کہ مشرقِ وسطیٰ اور خلیج فارس کے بادشاہ اور شیوخ امریکہ کو زیادہ ناراض نہ کریں، کیونکہ "وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اپنا اقتدار بچانے کے لئے صرف اور صرف امریکہ پر ہی بھروسہ کرسکتے ہیں"۔

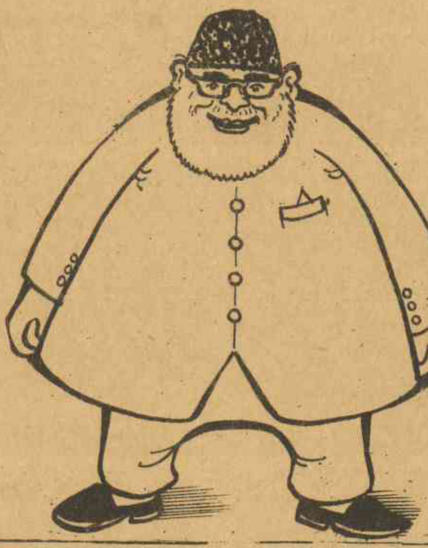
ہمارے خیال میں امریکہ مشرقِ وسطیٰ میں براہ راست فوجی مداخلت نہیں کرے گا۔ ویت نام میں اس کا جو حشر ہوا وہ اس کے سامنے ہے، اور وہ اسے دہرانے کی غلطی نہیں کرے گا، بلکہ اسرائیل پر دباؤ ڈالے گا کہ وہ ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء کے مقبوضہ علاقے عربوں کو واپس کردے، کیونکہ شاہ ایران نے بھی واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ "اس بات کو ہرگز قبول نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کے مقدس مقامات پر غیر مسلموں کا قبضہ رہے"۔

برزنیف کا دورہ بھارت

۲۶ نومبر کو سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری مسٹر برزنیف بھارت کا دورہ شروع کر رہے ہیں روس کی کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان "پراودا" نے لکھا ہے کہ مسٹر برزنیف کے دورۂ بھارت کا پورے ایشیا پر اثر پڑے گا۔ نووستی پریس ایجنسی کے مطابق برزنیف کا یہ دورہ برصغیر ہند و پاکستان میں قیامِ امن کو تقویت دے گا لیکن حالات ؟ بھارتی اور افغانی ذرائع ابلاغ عامہ کا رویہ روس کے موقف کی نفی کر رہا ہے۔ کیونکہ جیسے ہی مسٹر برزنیف کے دورۂ بھارت کی تاریخ کا اعلان کیا گیا۔ آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو کابل نے پاکستان کے خلاف پوری شدت سے پروپیگنڈہ شروع کردیا۔ آج کل بھارت اور افغانستان کے ریڈیو پختونستان اسٹنٹ کا بھرپور پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ اور کہا جا رہا ہے کہ پاکستان کے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آزادی کی تحریک

آزادی کی تحریک "زور پکڑ رہی ہے ۲۵ نومبر ۱۹۷۳ء کی رات کو آل انڈیا ریڈیو نے کابل ریڈیو کے حوالے سے خبر نشر کی کہ "پاکستان کے سرحدی صوبے میں آزادی کی مہم زور پکڑ رہی

باقی صفحہ ۳۱ پر



مولانا مودودی پھر بولے

وہ مسئلہ فلسطین کو اب بھی "وقتی مسئلہ" سمجھتے ہیں

مولانا، فلسطینی عوام کے حق خود اختیاری کے بارے میں کیوں خاموش ہیں ؟

جب مولانا مودودی نے بظاہر جماعت اسلامی کی سربراہی سے پردہ کرلیا تو یار لوگوں نے جو روزانہ اخبارات میں ان کے بیانات اور چہرۂ پرنور کی زیارت سے عاجز آگئے تھے، نمازِ شکرانہ ادا کی تھی، لیکن بھلا مودودی اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والے کہاں، کسی نہ کسی طرح بیان داغنے کا موقع نکال لیتے ہیں۔ ذرا بھی نہیں چوکتے، سو مشرقِ وسطیٰ کی حالیہ جنگ نے انہیں بیان داغنے کا موقع فراہم کردیا۔ ان کا بیان جماعت کے ترجمان ہفت روزہ ایشیا نے ۴، نومبر ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں ٹائٹل پر بڑی آب و تاب سے شائع کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"اب ان کے لئے اس قرارداد کو نافذ کرانے کا صرف ایک ہی ذریعہ رہ گیا ہے کہ وہ امریکہ کو اس وقت تک تیل کی سپلائی جاری نہ کریں جب تک اسرائیل ۱۹۶۷ء میں چھینے ہوئے مصر، شام اور اردن کے تمام علاقے خالی نہ کردے، جن میں لازماً بیت المقدس کو شامل ہونا چاہیئے"۔

وقت وقت کی بات ہے، ایک زمانہ تھا کہ امریکہ کے مخالفین مودودی کے نزدیک کافر اور ملحد تھے، اچھرہ کی ٹکسال میں سامراج دشمن عناصر کے خلاف کفر کے فتوے گھڑے جاتے تھے۔ اب نوبت یہ آگئی ہے کہ مودودی نہ صرف امریکہ کے خلاف بیان کی توپ داغتے ہیں بلکہ اسے تیل کی سپلائی جاری نہ کرنے کی بھی حمایت کرتے ہیں، لیکن ایک خاص بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ مسئلہ فلسطین کو ابھی تک "وقتی مسئلہ" سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اپنے حالیہ بیان میں انہوں نے مسئلہ فلسطین کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔ حالانکہ اب تو شاہ فیصل اور شاہ ایران بھی برملا کہنے لگے ہیں کہ جب تک فلسطینیوں کے حق خود اختیاری کو تسلیم نہیں کیا جاتا، اس وقت تک مشرقِ وسطیٰ میں مستقل امن کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ کیا مولانا مودودی وضاحت کرنا پسند کریں گے کہ وہ اسرائیل کے ناسور کا سرزمینِ عرب سے خاتمہ چاہتے ہیں یا ان کی دلچسپی صرف سلامتی کونسل کی قرارداد ۲۴۲ تک محدود ہے۔

الفتح رپورٹ

درسی کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ

درآمد شدہ کتب کی قیمتوں میں ۱۰۰ فیصد کا اضافہ

غریب والدین کی مشکلات بڑھ گئیں

وہ چہرے مہرے اور حلیہ سے کلرک معلوم ہو رہا تھا۔ تقریباً دو تین گھنٹوں سے وہ کتابوں کی دکانوں کے چکر لگا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اسے مطلوبہ کتابیں نہیں مل رہی تھیں۔ کیونکہ اس کی پریشانی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی گرمی اور سخت دھوپ سے وہ پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ ریگل کے قریب وہ ایک جگہ سائے میں دم لینے کے لئے رکا تو میں فوراً اس کے پاس پہنچ گیا۔ علیک سلیک کے بعد جب میں نے اس سے پریشانی کا سبب پوچھا تو اس نے بڑی تھکی تھکی آواز میں جواب دیا۔

"کیا بتاؤں جناب، میں اپنے بچے کے لئے تیسری جماعت کی کتابیں لینے آیا تھا۔ پچھلے سال کی قیمتوں کے مطابق روپے لے کر گھر سے نکلا تھا۔ لیکن بازار میں ان کتابوں کی قیمت معلوم کرنے کے بعد پتا چلا۔ کہ اتنے روپے میں تو مشکل سے دو یا تین کتابیں آئیں گی۔ نئے نصاب کی کتب کی قیمتوں میں تو زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ اب مجھے دوبارہ قرض لینا پڑے گا"۔

جی ہاں، یہ بات اپنی جگہ سو فیصد درست ہے کہ نصابی اور غیر نصابی کتب، مقامی اور درآمد شدہ کتب کی قیمتوں میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے۔ بڑے گھرانوں اور متمول لوگوں کا تو کچھ نہیں جاتا، ان کے یہاں دولت کی ریل پیل ہے۔ کسی چیز کی ہنگائی کا اثر ان کے بجٹ پر نہیں پڑتا، لیکن غریب اور متوسط طبقہ کے لوگوں کا کچومر نکل جاتا ہے۔ چنانچہ درسی کتابوں کی قیمتوں میں جو ہوشربا اضافہ ہوا ہے، اس سے نچلے اور متوسط طبقہ کے لوگ زیادہ متاثر ہوتے ہیں میری نظر میں نچلے اور متوسط طبقے کے ایسے کئی لوگ ہیں جنہوں نے کتابوں کی ہنگائی سے پریشان ہو کر اپنے بچوں کو اسکولوں سے ہٹا لیا ہے۔

اس سلسلے میں جب چھان بین کی گئی تو پتا چلا کہ ایک سال کی مدت میں مقامی طور پر طبع ہونے والی کتب اور درآمد شدہ کتب کی قیمتوں میں ۵۰ فیصد سے لے کر ۱۰۰ فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔ حالانکہ مقامی طور پر شائع ہونے والی کتب معمولی کاغذ اور کم صفحات پر مشتمل ہوتی ہیں پھر بھی ان کی قیمتوں میں ۵۰ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ جبکہ درآمد شدہ کتابوں کی قیمتوں میں سالِ گذشتہ کے مقابلہ میں ۱۰۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔

اضافہ کی بنیادی وجہ

کتب فروشوں اور پبلشروں کا کہنا ہے کہ پاکستان میں تیار ہونے والی کتابوں کی قیمت میں اضافہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کاغذ کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔

پبلشروں کا کہنا ہے کہ وہ کتابوں کی کوالٹی قائم رکھنے کے لئے اچھے کاغذ استعمال کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قیمت میں اضافہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۲ء میں جس کتاب کی قیمت ایک روپیہ ۸۵ پیسے تھی، اس سال اس کی قیمت ۲ روپے ۱۰ پیسے ہو گئی۔ سائنس کی کتابوں کی قیمت میں بھی زبردست اضافہ ہوا ہے۔

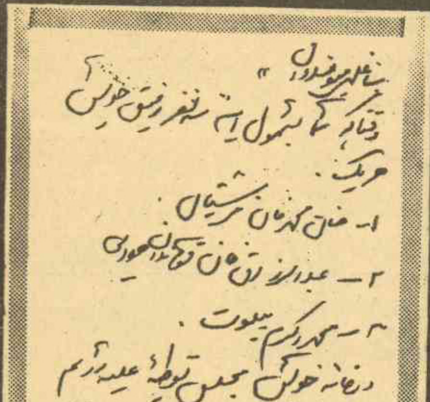
علاوہ ازیں جن کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ نہیں کیا گیا ہے، ان کتابوں کے صفحات کم رکھے گئے ہیں اور کاغذ گھٹیا استعمال کئے گئے ہیں۔ طباعت کا معیار بھی اچھا نہیں ہوتا ہے۔ کتب فروشوں نے بتایا کہ درآمد شدہ کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ کی بنیادی وجہ کرنسی کی قیمت میں کمی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ غیر ملکی کتابوں کی طباعت کے اخراجات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے درآمد شدہ کتب کی قیمت میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔

مکتوب کابل

ندیم نمائندہ الفتح مقیم کابل



افغان حکومت کی باگ ڈور روسی اور بھارتی افسروں کے ہاتھ میں ہے



ہاشم میوندوال کی تحریر کا ایک عکس جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ ان کے ساتھ کون کون سازش میں شریک ہے

کیا ہاشم میوندوال نے خود کشی کی تھی؟

افغانستان کے سابق وزیر اعظم ہاشم میوندوال نے جیل میں خود کشی کرلی! ریڈیو افغانستان نے اس خبر کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ جناب ہاشم میونڈال اس سازش کے سرغنہ تھے جو افغانستان کی موجودہ حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ ریڈیو افغانستان کے الفاظ ہیں — "اس غدار اور وطن فروش شخص نے اپنے جرم کا اعتراف کرنے کے بعد اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خود کشی کرلی"۔

کیا واقعی ہاشم میوندوال نے خود کشی کی ہے؟ کیا ہاشم میوندوال نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا؟ افغانستان کے سرکاری اخبار "جمہوریت" نے ان کے اس اعتراف کی ایک سند اپنی ۲ ر اکتوبر کی اشاعت میں شائع کی ہے۔ لیکن افغانستان کے عوام کی اکثریت کو اس سند کی صداقت پر شبہ ہے۔ بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ ہاشم میوندال کو اذیتیں دے کر اس سند پر دستخط کرائے گئے۔ علاوہ ازیں ہاشم میوندوال نے ان ہی اذیتوں سے پریشان ہو کر خود کشی کرلی حقیقت چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ افغانستان کی موجودہ حکومت کو داخلی استحکام کے لئے خاصی جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا لیتے کہ ان دنوں افغانستان کی خفیہ پولیس کی باگ ڈور روسی اور بھارتی افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ سردار محمد داؤد کا نجی محافظ دستہ بھی ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ کیونکہ سردار داؤد کو افغانی پولیس پر اعتبار نہیں رہا۔ ادھر افغانستان کے جنوبی حصے کے قبائل بغاوت پر آمادہ ہیں۔ پولیس اور افغانی فوج انہیں گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ یہ بغاوت کسی بھی لمحے خونریز فسادات کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ دریں اثنا افغان حکومت اپنی مشکلات پر پردہ ڈالنے کے لئے پاکستان کے خلاف اپنے عوام کو بھڑکانے پر تلی ہوئی ہے۔ افغانستان کا ریڈیو اور اخبارات پاکستان کے خلاف نفرت کی مہم میں پیش پیش ہیں۔ یہاں نت نئی افواہوں کے ذریعے عوام کو پاکستان کے خلاف کمربستہ کیا جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں یہ افواہ پورے افغانستان میں گشت کر رہی تھی کہ حکومتِ افغانستان نے دس پاکستانی ہوابازوں (PILOTS) کو گرفتار کیا ہے۔ جو بھیس بدل کر رکشے چلا رہے تھے۔ یاد رہے کہ کابل میں چلنے والے موٹر سائیکل رکشے ایک قبائلی سردار عارف شنواری کی ملکیت ہیں اور موجودہ حکومت نے اس شخص کو بھی حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں گرفتار کر رکھا ہے۔ عقل کے اندھوں سے کوئی اتنا پوچھے کہ آخر یہ

افغانستان میں دس پاکستانی ہوا باز بھیس بدل کر رکشے چلا رہے تھے؟

پاکستانیوں کو اقامتی ویزے نہیں دیئے جا رہے ہیں

دس پاکستانی ہوا باز کابل میں کیا کر رہے تھے؟ بفرضِ محال اگر دس پاکستانی ہوا باز گرفتار بھی ہو گئے ہیں، تو انہیں عوام کے سامنے کیوں نہیں پیش کیا جاتا؟ حکومتِ افغانستان کو دنیا کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ علاوہ ازیں افغانستان کے پاس روسی ساخت کے مگ ۲۱ قسم کے طیارے ہیں جبکہ پاکستانی ہوا بازوں کو چینی ساخت کے مگ ۱۹ طیاروں کو اڑانے کی تربیت دی گئی ہے۔ انہیں مگ ۲۱ طیارے اڑانے کے لئے کم از کم ایک سال کی مزید تربیت کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں کابل میں پاکستانی ہوا بازوں کی موجودگی کا الزام انتہائی مبالغہ آمیز اور لغو ہے۔ یہ اور اس سے ملتی جلتی تمام افواہوں کا بنیادی مقصد پاکستان کے خلاف افغانی عوام کے جذبات کو بھڑکانا ہے۔

ادھر افغانستان میں پاکستانی باشندوں کی حالتِ زار انتہائی خستہ ہے۔ حکومتِ افغانستان کی ہر ممکن کوشش کے باوجود فی الحال عوام میں پاکستانیوں کے خلاف شدید نفرت نہیں ابھری البتہ حکومت کی سطح پر پاکستانیوں کو قدم قدم پر پریشان کیا جا رہا ہے۔ پاکستانیوں کو مزید اقامتی ویزے نہیں دیئے جا رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومتِ افغانستان اپنے ملک میں پاکستانیوں کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ کابل کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر پاکستانی سیاحوں کو ذرا ذرا سی بات پر ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے۔ اُنہیں دھکے اور گالیاں دی جاتی ہیں۔

پاکستان ٹائمز کے محمد اسلم صاحب پچھلے دنوں کابل آئے ہوئے تھے۔ وہ ایک روز اپنے ایک افغانی دوست کو کوئی تحفہ دینے اُن کے گھر پہنچے۔ اس کے ساتھ ہی افغانی پولیس نے ان کے گھر پر چھاپہ مارا۔ اور محمد اسلم صاحب کو خواہ مخواہ دھر لیا کہ وہ اپنے افغانی دوست کو کوئی خفیہ پیغام دے رہے تھے۔ محمد اسلم نے اپنی صفائی پیش کی لیکن ان کی بات کسی نے نہیں سُنی اور انہیں تھانے لے جایا گیا۔ بعد میں پاکستانی سفارتخانہ کی مداخلت پر یہ قصہ ختم ہوا۔ محمد اسلم صاحب خوش قسمت ہیں کہ وہ اتنی جلدی اپنی جان چھڑا کر پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ یہاں رہنے والے ہر پاکستانی باشندے کو شکایت ہے کہ خفیہ پولیس والے ان کی نگرانی کرتے ہیں۔ وہ جہاں جاتے ہیں ان کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ ان کے گھروں کے باہر سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس والے گھومتے رہتے ہیں۔ پی۔ آئی۔ اے کے دفتر اور پاکستانی سفارتخانے کی عمارت کے باہر ان پولیس والوں کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ افغانی خفیہ پولیس کے محکمے میں ہر پاکستانی باشندے کی ایک فائل کھلی ہوئی ہے جس میں ان کے روزمرہ کے معمولات درج کئے جاتے ہیں عام پاکستانی شہری پر ہی کیا منحصر ہے، پی۔ آئی۔ اے اور پاکستانی سفارتخانے کے عملے کے افراد کو بھی دینے کے سلسلے میں پریشان کیا جا رہا ہے۔

کابل میں پاکستانی سفارتخانے کے بنک اکاؤنٹ کو منجمد کر دیا گیا ہے۔ انہیں اپنی ضرورت کے مطابق رقم نکلوانے کے لئے حکومتِ افغانستان سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ کیا پاکستان میں افغانی باشندوں کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جاتا ہے؟ پاکستانی حکام افغانستان سے دوستی کی باتیں کرتے ہیں۔ ہم جتنا ان کی طرف جھک رہے ہیں وہ اتنا ہی ہم سے دور ہو رہے ہیں۔ رُوس اور بھارت کی گود میں پلنے والی یہ "اسلامی مملکت" اپنے مسلمان بھائیوں کو دھتکارتی ہے اور ہندوؤں اور سکھوں کو اپنے سینے سے لگاتی ہے۔ روسی سوشل سامراج اور بھارتی توسیع پسندوں نے اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لئے افغانستان کو ایک کھلونا بنایا ہوا ہے۔

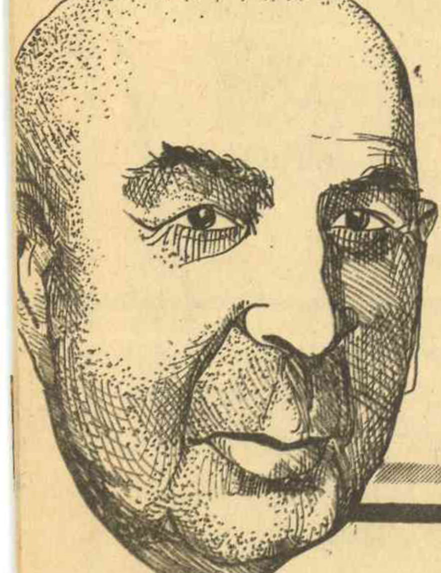
افغانستان کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی صورتحال انتہائی خستہ ہے۔ اس سلسلے میں نئی فوجی حکومت پرانی شاہی حکومت پر الزام دھرتی ہے کہ اس کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے افغانستان پسماندگی کا شکار ہوا ہے۔ جبکہ نئی فوجی حکومت نے بھی اس سلسلے میں اب تک کچھ نہیں کیا اور نہ ہی وہ مستقبل قریب میں کچھ کر سکتی ہے۔ روس اور بھارت کے مفادات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ افغانستان ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔

جوں جوں دن گذرتے جا رہے ہیں افغان عوام کے دلوں میں موجودہ فوجی حکومت کے خلاف شکوک و



اجمل خٹک کو ۶۰ ہزار افغانی ماہانہ کا وظیفہ

اجمل خٹک کو افغان حکومت ہر ماہ ۶۰ ہزار افغانی روپے فراہم کرتی ہے جس سے وہ اپنے گھریلو اخراجات پورے کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں افغانستان میں پختونستان کی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے انہیں ہر ماہ ایک معقول رقم دی جاتی ہے۔ انہیں جدید ماڈل کی اوپل کار دی گئی ہے۔ جس پہ پختونستان کا پرچم لہراتا رہتا ہے۔ ان کے گھر پر افغان پولیس کا پہرہ رہتا ہے۔ حکومتِ افغانستان کی پیشگی اجازت کے بغیر ان کے گھر پہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ □□



افغانستان کے اخبارات اور ریڈیو پر حکومت کا مضبوط کنٹرول ہے!

شبہات جنم لے رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ جمہوریت کے نام پر ان کی شخصی آزادیاں سلب کی جا رہی ہیں۔ جمہوریت کے نام پر ان پر بدترین آمریت مسلط کی جا رہی ہے۔ جمہوریت کے سنہرے خواب دکھا کر ان کے حقوق پامال کئے جا رہے ہیں۔ خاص طور پر پڑھے لکھے طبقے میں موجودہ حکومت پر کھلے عام تنقید شروع ہو گئی ہے۔ پیکنگ نواز طالبعلموں کی جماعت شعلۂ جاوید نے اگرچہ موجودہ حکومت کی ابتداء میں حمایت کی تھی لیکن اب انہیں بھی اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ افغانستان کو روس کی نوآبادی بنایا جا رہا ہے۔ انہیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ سردار محمد داؤد کے برادر سردار محمد نعیم کے حالیہ دورہ روس اور دورۂ بھارت کا بنیادی مقصد کیا تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ افغانستان کی موجودہ حکومت ان دنوں روس یا بھارت سے بالکل ویسا ہی دفاعی معاہدہ کرنا چاہتی ہے جیسا بھارت نے روس سے کر رکھا ہے۔ اور یہ سب کچھ پاکستان کے خلاف جارحیت کے ارادے سے کیا جا رہا ہے۔ افغانستان میں خود اتنا دم خم نہیں کہ وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر پاکستان پر حملہ آور ہو سکے۔ اسے فقط روس یا بھارت کی امداد کا انتظار ہے۔ جس روز اسے یہ امداد مل گئی وہ پاکستان میں ایک نیا بنگلہ دیش تخلیق کرنے کی کوشش کرے گا۔

نیشنل عوامی پارٹی کے سیکرٹری جنرل جناب، اجمل خٹک کو کون نہیں جانتا۔ یہ کابل میں پاکستان دشمن سرگرمیوں میں علی الاعلان حصہ لیتے ہیں۔ ہر ماہ دو ماہ بعد ریڈیو افغانستان سے پاکستان کی سالمیت پر حملے کرتے ہیں۔ اپنے ہر انٹرویو میں انہوں نے پاکستان کی یکجہتی کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ چند ہفتے قبل الفتح کو انٹرویو دیتے ہوئے بھی انہوں نے پاکستان کے خلاف خوب زہر اگلا ہے۔ کیا ایسے شخص کو دوبارہ پاکستان میں داخل ہونے کا حق حاصل ہے۔

اجمل خٹک کو افغان حکومت ہر ماہ ۶۰ ہزار افغانی روپے فراہم کرتی ہے جس سے وہ اپنے گھریلو اخراجات پورے کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں افغانستان میں پختونستان، کی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے انہیں ہر ماہ ایک معقول رقم دی جاتی ہے۔ انہیں جدید ماڈل کی اوپل کار دی گئی ہے جس پر پختونستان کا پرچم لہراتا رہتا ہے۔ ان کے گھر پر افغان پولیس کا پہرہ لگا رہتا ہے۔ حکومتِ افغانستان کی پیشگی اجازت کے بغیر ان کے گھر پر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ پشتو اکیڈمی جو بظاہر خالص ادبی سرگرمیوں کی آماجگاہ ہے۔ ان دنوں یہاں رضاکاروں کی بھرتی کی جا رہی ہے۔ یہ رضاکار پختون زلمے کہلاتے ہیں اور انہیں افغانستان ہی میں بھارتی فوجی گوریلا جنگ کی تربیت دے رہے ہیں۔ اس تربیت میں وسعت پیدا کرنے کے لئے سنا جاتا ہے کہ اجمل خٹک صاحب ایک بار بھارت کا دورہ بھی کر چکے ہیں۔ انہوں نے ایک حالیہ ملاقات میں اس بات کی تصدیق یا تردید نہیں کی۔ لیکن انہوں نے یہ ضرور کہا ہے کہ پختونستان کو آزاد کرانے کے لئے انہیں جہاں سے بھی امداد ملنے کی توقع ہو گی وہ وہاں ضرور جائیں گے۔

جہاں تک افغان عوام کا تعلق ہے انہیں پختونستان کے اسٹنٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ افغانی عوام میں پاکستانی عوام اور خاص طور پر وزیرِ اعظم بھٹو کے لئے محبت کے شدید جذبات پائے جاتے ہیں۔ وہ علی الاعلان سردار داؤد اور وزیرِ اعظم بھٹو کا موازنہ کرتے ہیں۔ سردار داؤد کو وہ ڈکٹیٹر اور وزیرِ اعظم بھٹو کو جمہوریت پسند اور ایشیا کا عظیم مدبر تصور کرتے ہیں۔ ہر افغانی کو اس بات کا احساس ہے کہ جب تک پاکستان میں وزیرِ اعظم بھٹو برسرِ اقتدار ہیں، پاکستان کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ میرے اس جملے کو بہت سے قارئین جملہ معترضہ سمجھیں گے ان کا خیال ہو گا کہ میں پیپلز پارٹی کی بے جا حمایت کر رہا ہوں لیکن کابل سے آنے والے آپ کسی بھی سیاح سے اس بارے میں دریافت کر سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے اور اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یقین جانئے اپنے ملک اور اس کے وزیرِ اعظم کے بارے میں افغانیوں کی اس محبت کی باتیں سن کر دل کو ایک گونا گوں اطمینان ہوتا ہے اور ہر پاکستانی کا سینہ فخر سے تن جاتا ہے۔

روس یا بھارت سے دفاعی معاہدہ کی تیاریاں کی جا رہی ہیں



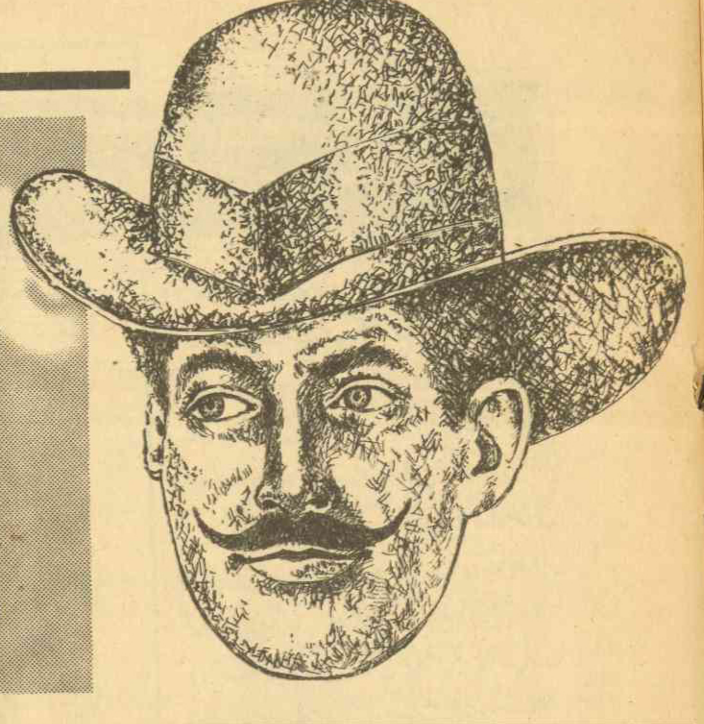
پشتو اکادمی

”پختونستان“ کی سرگرمیوں کا مرکز ہے

کابل کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر مسافروں کو ان دنوں جن دشوار گذار مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ افغان حکومت نے مسافروں پر پابندی عائد کر دی ہے کہ وہ اپنے ہمراہ پانچ سو، افغانی روپوں سے زیادہ نہیں لا سکتے۔ اس سلسلے میں کوئی عام اعلان نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسافر حسبِ سابق اپنے ہمراہ کافی رقوم لاتے ہیں جو ہوائی اڈے پر افغانستان کے کسٹم حکام ضبط کر لیتے ہیں۔ ضبط کی ہوئی یہ رقوم عام طور سے واپس نہیں کی جاتیں کیونکہ اس سلسلے میں کوئی رسید یا دوسری سند نہیں دی جاتی۔ یہ سب کچھ کس بین الاقوامی قانون یا اصول کے تحت ہو رہا ہے اس بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔

پانچ سو افغانی روپے تقریباً ایک سو پاکستانی روپوں کے برابر ہوتے ہیں۔ ایک ہفتہ یا ایک ماہ کے لئے افغانستان آنے والے مسافروں کو جب پانچ سو افغانی دیئے جاتے ہیں تو وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں، کہ اتنے دن افغانستان میں ان کا قیام کیسے ممکن ہے؟ کابل میں ایک معمولی ہوٹل کے کمرے کا کرایہ ڈیڑھ سو افغانی روپے یومیہ ہے۔ کھانے پینے اور تفریح کے اخراجات اگر شامل کئے جائیں تو پانچ سو افغانی روپوں میں دو دن بھی مشکل سے گذرتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ پابندی عام طور سے امریکیوں اور پاکستانیوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہندو، سکھ اور دوسرے ممالک کے باشندے اس پابندی سے مبترا ہیں۔ اس سلسلے میں ایک مثال دی جا سکتی ہے۔ چند روز پیشتر ایک پاکستانی ڈاکٹر کی اہلیہ کا کابل کے نزدیک ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب اپنی اہلیہ کی لاش پاکستان لے جانے کے لئے کابل آئے تو ہوائی اڈے پر ان کی فاضل رقم ضبط کر لی گئی اور انہیں صرف پانچ سو افغانی روپے دیئے گئے۔ ڈاکٹر صاحب بہت چیخے چلائے۔ کہ ان پیسوں سے مَیں اپنی اہلیہ کی لاش پاکستان کیسے لے جاؤں گا۔ لیکن ان کی کسی نے نہیں سنی اور انہیں بے عزت کر کے ہوائی اڈے سے نکال دیا گیا۔ بعد میں انہوں نے کیا انتظام کیا، اس بارے میں مَیں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغان حکام کا ہم پاکستانیوں کے ساتھ کیسا رویہ ہے؟

افغانستان میں جمہوریت کی مٹی کیسے پلید کی جا رہی ہے۔ اس بارے میں مَیں اپنے گذشتہ مکتوب میں تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ پچھلے دنوں میری ملاقات کابل کے سرکاری روزنامے ”جمہوریت“ کے مدیرِ اعلیٰ سے ہوئی۔ انہوں نے مجھے پختونستان کے مسئلے پر خاصی دیر تک قائل کرنے کی کوشش کی۔ اس پر مَیں نے ان سے پوچھا کہ وہ آزاد پختونستان سے کیا مطلب لیتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ برطانوی سامراج نے بلوچستان اور صوبہ سرحد کو افغانستان سے علیحدہ کر کے پاکستان میں شامل کر دیا۔ علاوہ ازیں پاکستان میں پشتو بولنے والے علاقوں پر افغانستان کا قدرتی حق ہے۔ ان کی یہ وضاحت سن کر مَیں نے ان سے کہا کہ افغانستان نے برطانوی دورِ حکومت میں آزاد پختونستان کا مطالبہ کیوں نہیں کیا؟ علاوہ ازیں اگر پاکستان میں پشتو بولنے والے علاقوں پر افغانستان کا حق ہے تو افغانستان میں فارسی بولنے والے علاقوں پر ایران کا حق ہونا چاہیئے۔ مَیں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ روسی علاقے سمرقند اور بخارا بھی کسی زمانے میں افغانستان کا حصہ تھے، افغانستان ان علاقوں کی، ملکیت کے بارے میں کیوں دعویٰ نہیں کرتا؟ کیا اس لئے کہ یہ علاقے اب ایک بڑی طاقت کی ملکیت ہیں۔ میرے ان سوالات کا ”جمہوریت“ کے مدیرِ اعلیٰ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بعد ازاں افغانستان میں جمہوری نظام کے بارے میں ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ وہ مجھ سے متفق تھے کہ ان دنوں واقعی افغانستان میں جمہوریت کی مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ اخبارات و ریڈیو سرکاری کنٹرول میں ہیں۔ افغانستان میں کوئی سیاسی پارٹی نہیں۔ عدالتی نظام سربراہِ مملکت کی خواہشات و ہدایات کا پابند ہے تقریر و تحریر کی آزادی نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ سب کچھ وقتی طور پر ہے۔ حالات کے سازگار ہوتے ہی افغانستان میں جمہوریت کا بول بالا ہو جائے گا۔ لیکن مَیں ان کے اس جملے سے متفق نہیں تھا۔ مَیں نے ان سے کہا قبلہ افغانستان کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہاں نہ تو کبھی جمہوریت آئی ہے اور نہ کبھی آنے کی اُمید ہے۔ یہاں آمریت یا شخصی حکومت کی روایت ہے۔ عوام اس حکومت سے آشنا ہیں۔ اُن میں سیاسی سُوجھ بُوجھ اور شعور نہیں ہے۔ حکومت کی طرف سے جو بھی اعلان کیا جائے وہ اُسے، حرفِ آخر یا پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں۔ وہ اس اعلان پر کوئی تبصرہ نہیں کرتے۔ کیونکہ سینکڑوں برسوں کی آمریت نے ان سے کسی بات پر تبصرہ کرنے کی صلاحیت ہی چھین لی ہے۔ افغانستان کے سابق وزیرِ اعظم جناب ہاشم میوندوال کی جیل میں خودکشی کے اعلان کو یہاں کے عوام نے حرفِ آخر سمجھ لیا۔ اس طرح افغانستان کی موجودہ حکومت کیخلاف مبینہ بغاوت میں پاکستان کی شمولیت کی خبر کو افغانی عوام نے بلا چوں و چرا تسلیم کر لیا۔ انہوں نے اس بارے میں کچھ سوچا سمجھا نہیں بلکہ افغانستان ریڈیو نے جو کہا اسے پتھر کی لکیر سمجھ لیا۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ پاکستان ان دنوں خود لاتعداد مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ اس کے پاس اتنا سرمایہ اور وقت کہاں سے آیا کہ افغانستان میں موجودہ حکومت کا تختہ اُلٹ سکے۔



سعیدہ

جماعتیو ں نے حکومت اور سوشلسٹو ں کے خلاف مہم تیز کر دی کا!

بھگت سنگھ تحریک آزادی کا جیالا سپوت تھا

لاہور میں چند دستی بموں کے دھماکے کے ساتھ ہی جماعتیوں کے رسائل اور اخبارات نے بڑے منظم طریقہ سے حکومت اور سوشلسٹوں کے خلاف پروپیگنڈہ کی نئی مہم شروع کردی۔ ایک تیر سے دو شکار کرنا اسی کو کہتے ہیں. ایک طرف حکومت پر یہ تنقید کی جارہی ہے کہ "تم نے سیاسی اور جمہوری عمل کو روک دیا ہے"۔ دوسری جانب زہر کے یہ تیر چلائے جارہے ہیں کہ یہ سارے دھماکے، سوشلسٹوں کی دہشت گردی ہے۔ منظم سازش ہے۔ گو ابھی یہ بات واضح نہیں ہو سکی تاہم آثار یہی بتارہے ہیں۔"

جماعتیوں کے ہفت روزہ "زندگی" کے تازہ شمارہ کا اداریہ پڑھ جایئے، پیٹ میں جرام کا بچہ کلبلاتا ہوا ملے گا۔ آدمی کی نیت میں جب فتور ہو تو پھر وہ اپنے باپ پر بھی الزام دھرنے سے باز نہیں آتا۔ اداریے میں حکومت اور سوشلسٹوں پر بے بنیاد الزامات لگائے گئے ہیں۔ جماعے، "سیاسی عمل روکو گے۔ تو سرزمین کی ہونی کارروائیاں بند کرادو گے تو زیرِ زمین آگ سلگے گی گندگی بکھیرو گے تو ہیضہ پھیلے گا۔ مچھروں کی پرورش کرو گے تو انسدادِ ملیریا کا محکمہ چل نہ سکے گا۔ ادھ پکی اشیا کھاؤ گے تو پیٹ میں درد اٹھے گا۔" وغیرہ وغیرہ۔

آگے چل کر کسی حفیظ خاں کی صفائی پیش کرتے ہوئے اداریہ نویس رقمطراز ہے کہ "یہ لوگ کسی پیشے کے بدمعاش نہیں، عادی مجرم نہیں، ان سے کوئی اخلاقی جرم سرزد نہیں ہوا حفیظ خان قوم کے دل کی جوان دھڑکن ہے اور

> **دستی بموں کے دھماکے**
> **رجعت پسندوں کی**
> **منظم سازش**

اس کے ساتھی بھی ایسے ہی ہیں"۔ اس سے آگے ... یہ کا لب ولہجہ کچھ یوں ہو گیا ہے، زیرِ زمین آگ سلگانے والے ہم نہیں ہیں، کوئی اور ہے۔ یہی سوشلسٹ وغیرہ، بھگت سنگھ۔ دہشت کی چیز تو بھگت سنگھ ہے۔ دیکھنا کہیں، بھگت سنگھ واپس نہ آجائے"۔ اور رہے ہم لوگ، تو مسکراہٹوں کے گلاب "حفیظ خان"، پکڑنے دھکڑنے کی چیز نہیں، چومنے چاٹنے کی چیز ہے۔ بھلا ہم سے ڈرنے خوفزدہ ہونے کی کیا بات، ہم تو ویسے ہی کبھی کبھار جمہوری عمل بحال کرنے کا غل غپاڑہ مچا دیتے ہیں تفریحاً۔

حکومت پر جمہوری عمل روکنے کا الزام عائد کرنے کے بعد برطانوی سامراج سے نبرد آزما ہونے والے اور آزادی کی مشعل جلانے والے ہیرو بھگت سنگھ پر خاک اڑانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "دہشت کی چیز تو بھگت سنگھ ہے۔ دیکھنا، کہیں بھگت سنگھ واپس نہ آجائے۔ بھگت سنگھ کو تو واپس نہیں آنا چاہیئے" ــــ گویا ان کے

باقی صفحہ ۱۵ پر

الفتح

پنجاب کے مزدور رہنما روزی خان سے ایک ملاقات



"شیخ صاحب ڈنڈا سنبھال لیں"

ایک کارکن کو پانچ روپے دینے سے انکار کر دیا گیا

نمائندہ الفتح

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب ایوب خان برسرِ اقتدار تھا۔ جمہوریت کی بحالی ایک خواب معلوم ہوتا تھا۔ انہی دنوں جمعیت العلمائے اسلام، نیپ اور پیپلز پارٹی کے متحدہ جلوس کا پروگرام تھا۔ پولیس نے اس جلوس پر لاٹھی چارج کیا۔ اور ۲۸ افراد کو گرفتار کر لیا۔ گرفتار ہونے والوں میں پیپلز پارٹی کے رہنما شیخ رشید، شیخ رفیق اور مولانا عبیداللہ انور بھی شامل تھے۔ وہیں روزی خان کی ملاقات جناب شیخ رشید سے ہوئی اور انہوں نے پیپلز پارٹی کے منشور سے متأثر ہو کر پارٹی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا چنانچہ وہ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۸ء کو پارٹی میں باقاعدہ شامل ہو گئے

روزی خان نے جیل سے رہائی کے بعد انارکلی میں پیپلز پارٹی کی شاخ قائم کی۔ انہیں کنوینر بنایا گیا۔ وہ ان دنوں پارٹی کے منشور سے خاصے متأثر تھے۔ جس میں سرمایہ داری، جاگیرداری اور استحصالی نظام کے خاتمے کا وعدہ کیا گیا تھا اور ملک میں لوٹ کھسوٹ سے پاک ایک سوشلسٹ نظام رائج کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ وہ مزدور ہیں چنانچہ قدرتی طور پر انہیں مزدور کسان راج کے قیام سے انہیں دلچسپی رہی ہے۔ پارٹی کے منشور کی انہی باتوں نے انہیں ایک سیاسی پارٹی میں کام کرنے پر اکسایا۔

پنجاب میں جناب شیخ رشید کے ساتھ انہوں نے کام شروع کیا۔ پھر مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ ایوب خان نے اقتدار یحییٰ خان کو سونپ دیا۔ انہوں نے اس دوران اپنا کام بند نہیں کیا اور ساتھیوں کے تعاون سے جگہ جگہ پیپلز پارٹی کے دفاتر قائم کئے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو سعدی پارک میں جلسہ عام سے خطاب کیا۔ جس پر ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا گیا۔ وہ ان دنوں کالا شاہ کاکو کے قریب پٹرول پمپ پر کام کر رہے تھے۔ وارنٹ گرفتاری جاری ہوتے ہی روپوش ہو گئے۔ کیوں کہ جناب شیخ رشید نے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ ۲۸ اکتوبر کو علاقہ میں ہونے والے ایک جلسہ عام سے خطاب کرنے کے بعد اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریں۔ دریں اثنا پولیس نے ان کے گھر والوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ان کے بھائی پر تشدد کیا گیا ان کے ماموں کو تھانے میں بلا کر پوچھ گچھ کی گئی۔

۲۸ اکتوبر کو انہوں نے پروگرام کے مطابق انارکلی میں جلسہ عام سے خطاب کیا۔ اس کے بعد انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اسیری کے دوران انہیں بھٹو صاحب کی ایک تقریر سے بڑا رنج ہوا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ میں نے کمیونزم روکنے میں زبردست کام کیا۔ جیل کے اندر بھٹو صاحب کی یہ تقریر بحث کا موضوع بنی رہی۔ رہائی کے بعد مزنگ پارٹی کے دفتر میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں تاج محمد لنگاہ، شیخ رشید، حنیف رامے اور مختار رانا شریک ہوئے۔ روزی خان نے اس اجلاس میں پارٹی کی سیاسی لائن پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے بھٹو صاحب سے مطالبہ کیا کہ پارٹی سے جاگیرداروں اور رجعت پسندوں کو نکالا جائے۔ اور ان پر پارٹی کا دروازہ بند کیا جائے۔ جناب حنیف رامے نے اس نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے کہا ـــ "آپ لوگ چیئرمین کے سخت اقدام کا ساتھ دیتے ہیں اور نرم باتوں پر ساتھ نہیں دیتے۔" مختار رانا نے پارٹی کی موقع پرست پالیسیوں پر شدید حملے کئے۔ جس کے نتیجے میں میٹنگ کے بعد دو سیاسی لائنیں واضح ہو گئیں۔

روزی خان نے بتایا کہ بعض چوٹی کے رہنما کارکنوں کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ کارکنوں کی عام گرفتاریوں کے دوران ایک چوٹی کے رہنما نے، جو ان دنوں مرکزی وزیر ہیں۔ ایک کارکن کو آمد و رفت کے لئے پانچ روپے دینے

سے انکار کر دیا۔

اسی دوران پارٹی کے چیئرمین سے روزی خان اور ان کے ساتھیوں نے ملاقات کی اور انہیں لیڈر شپ کی کمزوریوں سے آگاہ کیا۔ جناب بھٹو نے جناب شیخ رشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —— "شیخ صاحب ڈنڈا سنبھالیں"۔ شیخ صاحب نے جواب دیا۔ یہ سیاسی پارٹی ہے، پولیس پارٹی تو ہے نہیں۔

۲۳ نومبر ۱۹۷۲ء کو پنڈی میں پارٹی کا کنونشن ہوا جس میں یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ پارٹی اپنے منشور سے ہٹ گئی ہے۔ اس کنونشن کی روشنی میں روزی خان اور دوسرے کارکنوں نے جناب شیخ رشید سے ملاقات کی اور ان سے پوچھا کہ آپ بتائیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ کارکنوں نے ان پر زور دیا کہ وہ پارٹی سے استعفیٰ دے دیں، مگر انہوں نے اس بارے میں کوئی ٹھوس فیصلہ نہ کیا۔ جس سے تمام کارکن بددل ہو گئے اور انہوں نے پارٹی میٹنگوں میں جانا بند کر دیا۔

روزی خان نے عملی طور پر پارٹی سے علیحدہ ہونے کے بعد پنجاب کے مزدوروں میں کام شروع کر دیا۔ اور اب وہ لاہور فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز میں کام کر رہے ہیں۔

انہوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ پنجاب کے مزدور پہلے سے کہیں زیادہ باشعور اور منظم ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مزدوروں کو ٹریڈ یونین ازم پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ ملکی سیاست میں بھرپور طریقہ سے حصہ لینا چاہیئے۔ تاکہ استحصالی طبقوں کا تختہ الٹ کر مزدور کسان راج قائم کیا جا سکے۔

انہوں نے اس بات کی ضرورت پر زور دیا، کہ مختلف علاقوں کی مزدور اور کسان تحریک کے درمیان اصولوں اور کام کی بنیاد پر اتحاد اور رابطہ قائم کیا جانا چاہیئے۔ یہ اتحاد کم سے کم اصولی سامراج دشمنی، جاگیردار دشمنی اور سرمایہ دار دشمنی پر مبنی ہو۔

انہوں نے بتایا کہ پنجاب کے مزدور پختہ سیاسی شعور کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یکم مئی کے جلوس میں کم از کم ایک لاکھ افراد نے شرکت کی، جبکہ مارچ ۷۳ء میں مہنگائی کے خلاف صرف لاہور کے ایک جلوس میں ۳۰ ہزار افراد نے شرکت کی۔

انہوں نے بتایا کہ سندھ کی طرح پنجاب میں بھی دھڑا دھڑ مزدوروں کی برطرفیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ کوٹ لکھپت، ریلوے روڈ، ملتان روڈ، جی ٹی روڈ، شاہدرہ، فیروز پور روڈ سے بڑی تعداد میں مزدور نکال دیئے گئے۔ اور جو آج تک بحال نہیں ہو سکے۔ انہوں نے بتایا کہ لال انڈسٹری، گرینڈ بیٹری، اور شاہ نور اسٹوڈیو میں چھانٹی ہوئی۔ انہوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ سندھ کے کسانوں کی طرح پنجاب کے کسانوں پر بھی بے تحاشہ ظلم ہو رہا ہے۔

انہوں نے کہا کہ مزدوروں اور کسانوں کی جدوجہد کا مقصد شخصیت اور چہرے تبدیل کرنا نہیں ہے، بلکہ ان کی جدوجہد کا محور استحصالی سماج کا مکمل خاتمہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ پورے ملک میں کسانوں اور مزدوروں کی جدوجہد کو آپس میں مربوط ہونا چاہیئے۔

بقیہ: جماعتیے اور بھگت سنگھ

نزدیک بھگت سنگھ بے معنی دہشت گردی کا نام ہے۔ بھگت سنگھ سے ڈرو، بھگت سنگھ سے بچو، بھگت سنگھ کو دوبارہ نہیں پیدا ہونا چاہیئے"۔ زندگی کا نام لینے والے "زندگی" سے کتنی نفرت کرتے ہیں، اس کی مثال ہمیں اس ہفت روزہ سے ملتی ہے۔

اب ان عقل کے اندھوں کو یہ بات کون سمجھائے کہ بھگت سنگھ بے معنی دہشت گردی کا نام نہیں ہے بھگت سنگھ ایک شعلہ جوالہ تحریک کا نام ہے۔ ایک محب وطن شخص کا نام ہے۔ اور جب اُسے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کے "جرم" میں پھانسی دی گئی تو اُس نے پھندہ چوم لیا تھا اور برصغیر کی بہت سی ماؤں نے اپنے بچوں کا نام بھگت سنگھ رکھ دیا تھا۔

بھگت سنگھ نے سیاسی جدوجہد کے دوران اپنے ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اپنے ہم وطنوں کو کوئی گزند نہیں پہنچائی، اس نے برطانوی سامراج کے جابرانہ تسلط کو للکارا تھا۔ اس کے دشمن غیر ملکی لٹیرے تھے جنہوں نے اس کے ہم وطنوں کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دیا تھا اور اس کے وطن کی سوندھی سوندھی مٹی کو اپنے بوٹوں سے روند رہے تھے۔ وہ برصغیر کی آزادی کا ایک قابل قدر رہنما اور ہیرو تھا۔ اور آج بھی پاک و ہند میں لاکھوں افراد اس کی قربانیوں کے معترف ہیں۔

قریشی برادران شاید بھگت سنگھ سے اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ اُس نے اُنہی جیسی رنگت والے، ابرص زدہ جسم کے سفید فاموں کو للکارا تھا۔ "گورو ہمارے وطن سے نکل جاؤ، ورنہ ہم تمہیں مار مار کر نکال دیں گے"

اگر قریشی بھائیوں کی جوڑی اس بنیاد پر بھگت سنگھ سے نفرت کرتی ہے تو بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہے، کہ بھگت سنگھ اس جوڑی کے آقاؤں کو مار بھگانے کیلئے دستی بموں کے دھماکے کرتے تھے۔ اور ان دھماکوں سے سفید فام آقاؤں کی اولاد آج تک لرزہ براندام ہے۔

اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر بھگت سنگھ پر خاک اڑانے کی دوسری وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ دستی بموں کے دھماکے رجعت پسندوں کی کسی منظم سازش کے تحت شروع کئے گئے ہیں۔ زندگی کا اداریہ پڑھ کر یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ کہ بڑی صفائی سے ملک میں جمہوری عمل کو روکنے کا شکوہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اشارے کئے گئے ہیں کہ سوشلسٹ زیر زمین کام کرنے کے ماہر ہیں اور یہ ساری کارروائیاں یہی لوگ کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہم سے تو ہاتھ ملا لیجئے اور ان کو رگیدئیے۔ اگر جماعتیوں کا یہ نشانہ ٹھیک بیٹھ گیا تو واہ واہ سبحان اللہ پھر ملک میں جمہوری عمل چالو ہو جائے گا۔ اسی کو کہتے ہیں ایک تیر سے دو شکار۔



سندھ میں ہاریوں کی بیدخلیاں!

فصل الٰہی

وڈیرے اور سول حکام زرعی اصلاحات کو ناکام بنانا چاہتے ہ

سجاول میں ایک زمیندار کے مسلح غنڈوں نے آٹھ ہاریوں کو شدید زخمی کر دیا!

پنو عاقل سے تین میل دور مصالحانی کے قریب ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر کپاس کی فصل تیار کھڑی تھی۔ یہ زمین زرعی اصلاحات کے تحت ایک بے زمین ہاری کو ملی تھی اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ ایک دن اپنی زمین کا مالک بن جائے گا۔ وہ دوسروں کی زمین میں لہلہاتی ہوئی فصل دیکھتا تو اس کے بازو کی مچھلیاں پھڑکنے لگتی تھیں۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبانے لگیں۔ اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر خدا سے دعا مانگتا۔ ”مجھے بھی ایک زمین کا ٹکڑا دلا دے مولا۔ تیرا بڑا اکرم ہوگا“۔ اس کی دعا قبول ہوئی۔ زرعی اصلاحات کے تحت اسے بنجر زمین کا ایک ٹکڑا مل گیا۔ اس نے شکر ادا کیا اور رات دن محنت کر کے بنجر زمین کا سینہ نرم کر دیا۔ اب کپاس کی فصل تیار کھڑی تھی۔ وہ آج کہیں کام سے باہر گیا ہوا تھا، اس کی زمین پر اس وقت اس کے گھر کی دو عورتیں موجود تھیں۔ اچانک مغرب کی سمت سے گرد و غبار کا بگولا اُٹھا۔ اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ گرد و غبار کا پردہ چاک ہوا تو اس میں سے چند مسلح گھوڑ سوار نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں اور انہوں نے اپنے چہروں کو بڑی بڑی پگڑیوں میں چھپا رکھا تھا۔

گھوڑ سوار قریب پہنچ کر کپاس کے کھیت کے چاروں طرف پھیل گئے۔ یہ سب کے سب اس زمیندار کے مسلح آدمی تھے۔ جس کی زمین کا یہ ٹکڑا زرعی اصلاحات کے دوران بے زمین ہاری کو مل گیا تھا۔ زمین دار نے کئی بار ہاری کو دھمکی دی تھی کہ وہ زمین کا قبضہ چھوڑ دے، لیکن ہاری نے مالکانہ حقوق کے کاغذات دکھاتے ہوئے جواب دیا تھا کہ ”یہ زمین حکومت نے دلائی ہے، اگر زمین واپس لینا چاہتے ہو تو جاؤ حکومت سے لو، میں اپنی زندگی میں قبضہ نہیں چھوڑوں گا“۔ زمیندار غصہ میں پیچ و تاب کھاتا ہوا واپس چلا گیا، لیکن ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دے گیا کہ اس فصل سے تم فائدہ نہ اُٹھا سکو گے۔ فصل جب تیار ہوگئی تو زمیندار کے آدمیوں نے حملہ کر دیا گھوڑ سواروں

میں سے ایک شخص نے بندوق لہراتے ہوئے کہا۔ ”تم
کھیت سے نکل جاؤ، ہم فصل کاٹنے آئے ہیں“۔
نے چیخ کر جواب دیا۔ ”ظالمو! ہماری زندگ
ایسا نہیں کر سکتے“۔

اتنا سنتے ہی مسلح افراد نے اندھا دھند
شروع کر دی۔ دونوں عورتیں مسماۃ کوڑی اور
زخمی ہو کر کھیت میں گر گئیں۔ اُن کی چیخ و پکار سن کر
کے دوسرے کسان اور دیہاتی لاٹھیاں، ڈنڈے
لے کر جمع ہو گئے۔ زمیندار کے مسلح آدمیوں نے
والوں کو جمع ہوتے دیکھا تو فائرنگ کرتے ہوئے
سجاول میں کسی ہاری ایک عرصہ سے زمین
کرتے آرہے تھے۔ علاقہ کے زمیندار نے انہیں



دھمکی دی کہ وہ زمین کا قبضہ چھوڑ دیں، ورنہ انہیں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ ہاریوں نے ان کی دھمکیوں کی، پرواہ نہ کی اور زمین پر معمول کے مطابق کاشت کرتے رہے آخر ایک دن زمیندار کے مسلح افراد نے منگسی ہاریوں پر حملہ کر دیا۔ اور آٹھ ہاریوں کو بُری طرح زخمی کر دیا۔ ان میں سے بعض ہاریوں کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے۔ پولیس نے چند ملزموں کو گرفتار کر لیا، لیکن اصل مجرم فرار ہو گیا اور اب بھی وہ زخمی ہاریوں کو اعلانیہ دھمکی دیتا پھر رہا ہے۔ " زمین کا قبضہ چھوڑ دو، ورنہ اس سے زیادہ خطرناک نتائج بھگتنے کے لئے تیار رہو—"

سیتا روڈ سے چھ میل دور دیہہ بھلے میں زرعی زمین پر زمیندار کے مسلح کارندے ناجائز قبضہ کرنے کی نیت سے پہنچ گئے۔ اس زمین کے ہاری آسانی سے قبضہ دینے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ چنانچہ دونوں گروہوں کے درمیان زبردست مسلح تصادم ہو گیا۔ تین افراد شدید زخمی ہو گئے جنہیں خیرپور ناتھن ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

جیکب آباد کی تحصیل ٹھل کے موضع ہوت واہ کا واقعہ عبرتناک ہے۔ ہاری بیٹھا ہوا اپنی فصل کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اُس نے فصل کی تیاری میں رات دن ایک کر دیا تھا۔ آج اس کی محنت لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں کھڑی تھی۔ اچانک بیس مسلح افراد اس کے کھیت میں گھس آئے۔ اسے رسیوں سے باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ اور پھر پوری فصل کاٹ کر لے گئے۔

ٹنڈو الہ یار میں زمیندار کے کامدار آدم نے مشتعل ہو کر ایک ہاری کو قتل کر دیا۔ پولیس نے کامدار کو گرفتار کر لیا۔

اطلاعات کے مطابق گدو بیراج کے بائیں کنارے پر واقع خاص کر گھوٹکی سب ڈویژن میں زرعی، اراضی مستحق کسانوں کی بجائے بااثر افراد میں تقسیم کی گئی، سرکاری عملہ اس ناجائز کاروبار میں ہزاروں روپیہ کما رہا ہے۔ اس ناانصافی پر ہاریوں نے متعدد بار احتجاج کئے۔ کئی بار ہنگامہ اور فساد کا بازار گرم ہوا۔ لیکن یہ کاروبار بند نہ ہوا جس سے ہاریوں میں بے چینی اور بے اطمینانی پھیل گئی۔



زمینداروں نے ہاریوں کو بیج دینے سے انکار کر دیا

زمینداروں کے خلاف کارروائیاں

شہداد کوٹ میں پولیس نے ایک ہاری کی زمین پر زبردستی قبضہ کرنے والے آٹھ مسلح افراد کو گرفتار کر لیا۔

زرعی اصلاحات کی خلاف ورزی کرنے والے آٹھ زمینداروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ جن زمینداروں کو گرفتار کیا گیا، ان میں ٹھٹھہ کے حاجی بدھو سومرو، میرپور بٹھورو، مشتاق احمد چانڈیو، میرپور بٹھورو حاجی محمد صادق میمن، سجاول، خوشی محمد ارائیں، سجاول اللہ ڈنو، محمد یحییٰ سومرو ٹھٹھو لغاری، محمد قاسم اور جمیسو خان شامل ہیں۔

ٹھٹھہ کے ایک اور بااثر زمیندار سید قادر ڈنو شاہ شیرازی کو زرعی اصلاحات کی خلاف ورزی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ زمیندار نے اپنے ہاری کو بیج دینے

سے انکار کر دیا تھا۔

اسی طرح گمبٹ میں کھوڑہ کے زمیندار عبدالطیف کو بیج نہ دینے کی شکایت پر ڈی پی آر کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔

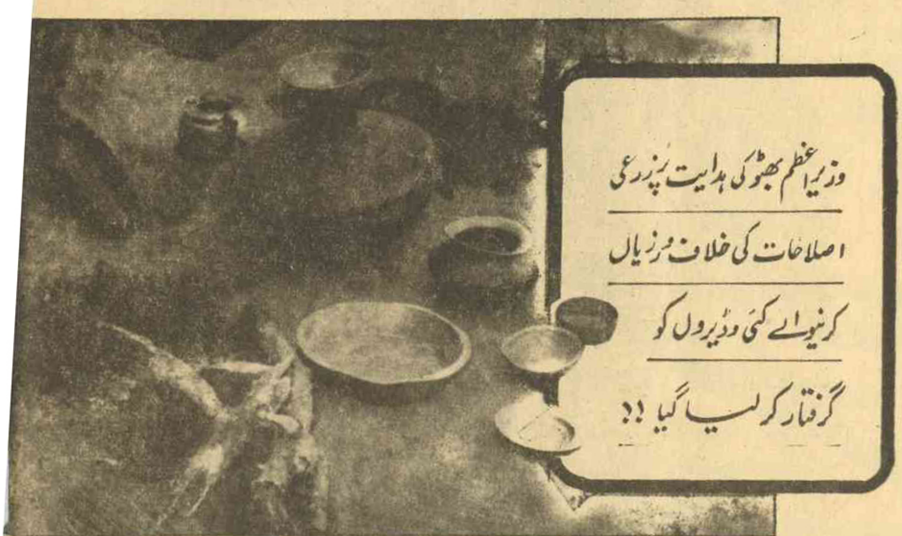
اب تک سندھ کے متعدد علاقوں سے ایسے کئی بااثر زمینداروں کو ڈی پی آر کے تحت گرفتار کر لیا گیا ہے جنہوں نے اپنے ہاریوں کو زرعی اصلاحات کے تحت بیج اور دیگر زرعی سہولت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

ان واقعات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے ۔ کہ وڈیروں اور زمینداروں نے زرعی اصلاحات کو دل سے قبول نہیں کیا۔ وہ ہاریوں کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں اور اس بات کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں کہ ہاریوں کو کسی قسم کی مراعات دی جائیں۔ ماضی میں بھی ان کا رویہ انتہائی سنگدلانہ تھا۔ اور وہ ہاریوں پر لرزہ خیز مظالم ڈھاتے تھے۔ موجودہ حکومت نے اس نکتہ کو خوب اچھی طرح محسوس کیا تھا۔ چونکہ الیکشن کے دوران مسٹر بھٹو نے دیہی علاقوں کا بذات خود دورہ کیا تھا، اس لئے وہ حالات کی نزاکت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ان کی پہلی نشری تقریر میں ان حالات کے بارے میں واضح اشارے ملتے ہیں۔

زرعی اصلاحات کا مقصد بھی شائد یہی تھا کہ دیہی علاقوں کی پسماندہ آبادی کی بنیادی ضرورت کسی حد تک پوری کر دی جائے۔ لیکن بدقسمتی سے ہاریوں کے خون پر پلنے والے وڈیروں، جاگیرداروں، اور زمینداروں نے ان اصلاحات کو قبول نہ کیا۔ اور ہاریوں پر ظلم کی انتہا کر دی۔ زرعی اصلاحات کے بعد وڈیروں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ انہوں نے ہاریوں کو مالکانہ حقوق نہ دیئے۔ جن زمینداروں نے مالکانہ حقوق دے دیئے وہ درپردہ ہاریوں کو دھونس اور دھمکی دیتے رہے کہ وہ فصل زمیندار کو دے۔ ہاریوں کی جبری بے دخلی کے واقعات میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اگر دیہی علاقوں کی راشی اور بددیانت انتظامیہ حالات کی نزاکت کو سمجھتی تو وہ ابتدا ہی میں زرعی اصلاحات سے منکر زمینداروں کے خلاف کارروائی کرتی اور قانون شکنی کے واقعات پر مؤثر کنٹرول کرتی،

لیکن چونکہ انتظامیہ کے بیشتر راشی افسران نے زمینداروں سے ساز باز کر رکھے ہیں۔ اس لئے اس قسم کے واقعات کی روک تھام نہ کی گئی۔ اور جس کے نتیجے میں ہاریوں کی جبری بے دخلی اور زرعی اصلاحات کی خلاف ورزی کے واقعات میں اضافہ ہوتا رہا۔

۳۰ اکتوبر کو وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے سندھ کے دیہی علاقوں کا طوفانی دورہ کیا۔ اور کھلی کچہریاں منعقد کیں، ڈوکری اور ہالا میں کھلی کچہری کے دوران انہوں نے بذاتِ خود اس بات کو محسوس کیا۔ کہ سندھ کے زمیندار زرعی اصلاحات کی زبردست



خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اور ہاریوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ہاریوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے زمینداروں کو متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے ہاریوں کے حقوق غصب کئے اور زرعی اصلاحات پر عملدرآمد نہ کیا تو زمینداروں کی حدِ ملکیت میں مزید کمی کر دی جائے گی۔“

زرعی اصلاحات کی خلاف ورزی کرنیوالے زمیندار دراصل مقامی انتظامیہ کے افسران کے اشارے پر اچھل کود مچا رہے ہیں، حکومت کو زمینداروں کے مزاج، درست کرنے کے ساتھ ان راشی اور بدعنوان افسران کی بھی خبر لینی چاہیئے، جو مطلق العنان بادشاہوں کی طرح

اپنی اپنی جاگیروں میں ہاری دشمن کارروائیوں میں مصروف ہیں۔

وزیراعظم بھٹو کے کھلی کچہری کے دوران اعلان کا مثبت اثر ہوا۔ ڈپٹی کمشنر ہڑبڑا کر بیدار ہوگئے اور زرعی اصلاحات کی خلاف ورزی کرنے والے زمینداروں کے خلاف کارروائی شروع کر دی گئی۔

وزیراعظم بھٹو کے بعد سندھ کے وزیراعلیٰ جناب ممتاز بھٹو نے بھی سندھ کے اضلاع کا دورہ کیا۔ انہوں نے اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ بعض بااثر زمیندار زرعی اصلاحات کی کھلی خلاف ورزی میں مصروف ہیں۔ اور وہ ہاریوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ انہوں نے مقامی انتظامیہ کو خبردار کیا کہ ایسے زمینداروں کے خلاف فوری طور پر قدم اٹھائے جائیں۔ وزیراعظم بھٹو اور وزیراعلیٰ سندھ ممتاز بھٹو کے دورہ کی وجہ سے قانون شکن زمینداروں کے خلاف کارروائیاں تیز کر دی گئیں۔ اور انہیں دھڑا دھڑ ڈی پی آر کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اندرون سندھ کے تمام ڈپٹی کمشنروں اور پولیس کو مزید کس دیا جائے کہ وہ ایسے زمینداروں کو کسی قیمت پر معاف نہ کریں جو ہاریوں کے حقوق غصب کرتے ہیں۔ ■

اشک کا سمندر

افسانہ

نعیم آروی



بچہ زیبرا کراسنگ سے سڑک کی دوسری جانب جا رہا تھا! ابھی وہ فٹ پاتھ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک ایک تیز رفتار کار اسے عقب سے ٹکر مارتی ہوئی زناٹے سے نکل گئی۔ اور یہ جوان لڑکا بندھی ہوئی بوری کی مانند تین چار قلابازیاں کھاتا ہوا فٹ پاتھ پر گرا اور پھر جیسے اس کے جسم میں کرنٹ لگ گیا ہو" میرا خیال ہے کہ وہ درد کی شدّت ہی تھی جو اسے پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح پھڑکاتی ہوئی دوبارہ سڑک کے کنارے لے آئی۔

یہ حادثہ نرسری کے قریب پیش آیا تھا جن لوگوں نے یہ منظر دیکھا ان کے منہ سے بے اختیار تیز سسکاریاں نکل گئیں۔

اُف اُف، چہ چہ، مر گیا۔

نہیں، نہیں ابھی زندہ ہے، دیکھو کیا ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا ہے۔

ہلتے ہلتے کیا جوان ہے۔

دیکھتے دیکھتے اس جگہ تماش بینوں کی ایک بھیڑ اکٹھی ہوگئی جو لوگ آگے کھڑے تھے وہ اطمینان سے نوجوان لڑکے کے مرنے کا تماشہ دیکھ رہے تھے، جو بھیڑ کے پیچھے کھڑے تھے اور جن کا قد چھوٹا تھا وہ گردن اچکا اچکا کر اس کی موت کا منظر ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے۔ اس اتفاقیہ حادثے نے انہیں نمک مرچ لگا کر دوسروں کو خبر سنانے کا اچھا خاصا موقع فراہم کر دیا تھا۔

حادثہ کا شکار ہونے والے نوجوان کے جسم سے سرخ خون نکل کر سڑک پر پھیل رہا تھا۔ اس کی ناک اور منہ سے بھی خون جاری تھا، قمیص اور پاجامہ جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اس میں سے جھانکتے ہوئے جسم کے بعض حصّوں کی رنگت سفید پڑ گئی تھی، رہ رہ کے اس کا جسم پھڑکتا اور گلے سے خرخر کی آواز تیزی سے نکلتی تھی۔

کسی نے دکھ بھرے لہجہ میں کہا: "ارے کوئی دوڑ کر پانی تو لاؤ، آخری وقت میں دو گھونٹ پانی سے اس کا حلق تو تر کر دو۔"

"یہاں پانی کہاں سے ملے گا، قریب پانی کا کوئی نل بھی نہیں ہے۔"

ارے بھائی پانی وانی چھوڑو، پولیس والوں کو خبر کرو۔

پولیس کیا کرے گی۔ اسے جلدی سے ہسپتال پہنچانے کا انتظام ہونا چاہیئے۔

ہاں، ہاں، ہسپتال پہنچانا چاہیئے۔ شاید بچ جائے، بے چارہ۔

"جلدی کرو بھائیو، اسے ہسپتال پہنچاؤ۔" بہت ساری آوازیں مکھّی کی طرح بھنبھنائیں۔

ہاں، مگر کیسے ہسپتال لے جاؤ گے، گاڑی والا تو ٹکر مار کر بھاگ گیا۔

کسی ٹیکسی میں لے چلو، آٹو رکشہ پکڑو۔

ہاں۔ کسی ٹیکسی کو رکواؤ۔

ٹیکسی رکواؤ، ٹیکسی رکواؤ، ہر آدمی ایک دوسرے سے یہی کہہ رہا تھا۔ خالی رکشہ اور ٹیکسیاں تیزی سے گزرتی رہیں۔ آخر ایک نوجوان نے جھلّا کر کہا، تم لوگ خالی خولی منہ سے بولتے رہو گے یا ٹیکسی بھی رکواؤ گے۔

سالے ڈیڑھ سو روپے کی خاطر لاش چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہیں، کیا زمانہ آگیا، آخ تھو!"

یہ کام تم ہی کیوں نہیں کرتے۔ ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے ناصحانہ انداز میں جواب دیا۔

نوجوان بڑے طیش کے عالم میں بھیڑ کو چیرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے لمبے لمبے بال کندھوں پر ہوا سے لہرا رہے تھے۔ اس نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔ مگر وہ بھیڑ دیکھ کر رکا نہیں، تیزی سے نکل گیا۔ دوسری سمت سے ایک آٹو رکشہ آ رہا تھا، اس نے ہاتھ اٹھا کر رکشہ رکوا لیا۔ رکشہ والے نے سوال کیا کہاں جانا ہے۔؟ نوجوان نے جواب دیا، بھائی مجھے نہیں جانا ہے، ایک آدمی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے، اسے ہسپتال پہنچانا ہے۔

رکشہ والے نے جواب دیا، مجھے لفڑے میں نہیں پڑنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ ہوا ہو گیا۔

نوجوان نے اس کے بعد ٹیکسی روکنے کی مزید ایک آدھ بار کوشش کی، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا، اس نے چوری چوری اِدھر اُدھر دیکھا۔ لوگ تماشہ دیکھنے میں محو تھے، اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ چپ چاپ وہاں سے کھسک گیا۔

اتنے میں ایک خدا ترس ٹیکسی والا خود ہی اس جگہ رک گیا۔ اسے سِسک سِسک کر دم توڑنے والے نوجوان پر بڑا رحم آیا۔ وہ زخمی کو ہسپتال پہنچانے پر تیار ہوگیا لیکن اب زخمی کو اٹھا کر اس کی ٹیکسی میں ڈالنے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ ٹیکسی والا بار بار ان کی غیرت کو للکارتا رہا۔ خدا اور اس کے رسولؐ کا واسطہ دیتا رہا۔ مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، لوگ بت بنے کھڑے تھے۔ اگلی صف سے کچھ لوگ آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ بھیڑ بڑی حد تک چھٹ گئی۔ پولیس والے کا ابھی تک پتہ نہ تھا۔ چونکہ زخمی نوجوان بائیں جانب فٹ پاتھ سے قریب پڑا تھا۔ اس لئے ٹریفک کا مسئلہ بھی پیدا نہ ہوا۔

ٹیکسی والے نے جرأت سے کام لیتے ہوئے قریب المرگ نوجوان کو اٹھا کر اپنی ٹیکسی کی پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ اس کا خون سے تر بتر ہاتھ سیٹ کے نیچے جھول رہا تھا۔ ٹیکسی والے نے بھیڑ کی طرف دیکھ کر کہا: "بھئی ایک آدمی زخمی کے ساتھ چلو۔ وہاں رپورٹ بھی تو لکھوانی ہوگی۔ میں تو بہت بعد میں پہنچا ہوں۔

تماشا دیکھنے والوں کے سر ایک بار اور جھک گئے، ٹیکسی والا جھلّا گیا، کیا تم میں کوئی مرد نہیں۔ اس نے ایک موٹی گالی دے دی۔ اس پر بھی کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ ایک بڑے میاں نے غرّا کر کہا۔ گالی مت دو۔

ٹیکسی والے کے جسم میں آگ لگ گئی۔ ارے غیرت کھاؤ، غیرت، بڑا مسلمان بنتا ہے۔ تیرے چہرے پر داڑھی ہے۔ ایک مسلمان بھائی مر رہا ہے اور تو اس کی مدد نہیں کرتا۔ شرم کرو، شرم۔

بڑے میاں نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے ڈھیلے لہجہ میں جواب دیا۔ بابا مجھے عصر کی نماز پڑھنی ہے، ورنہ میں تمہارے ساتھ چلا چلتا۔ انہوں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے دوسرے شخص سے کہا: "بھئی تم ہی چلے جاؤ۔ یہ حادثہ تو تمہارے سامنے ہوا تھا۔"

خدا کا خوف کرو، میاں، یہ ایکسیڈنٹ میرے سامنے کب ہوا۔ میں تو ابھی ابھی آیا ہوں۔ بزرگی بلا طویلے کے سر۔ یہ کہہ کر وہ شخص بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔

ٹیکسی والے نے بڑی بیچارگی سے ایک قدرے ادھیڑ عمر کے شخص کی جانب دیکھتے ہوئے کہا: "تم ہی چلے چلو بھائی۔ اگر زیادہ دیر ہوگئی تو بندہ مر جائے گا۔"

اس نے اپنے پھلوں کا دونا سینے سے مزید چپکاتے ہوئے بے زاری سے جواب دیا: "نہ بابا۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ دوسرے کے معاملہ میں ٹانگ اڑاؤں۔ ایکسیڈنٹ کی بات ہے، عدالتوں اور پولیس کا رگڑا کون کھائے گا۔ وہ پھلوں کا دونا سینے سے لگائے وہاں سے چل دیا۔

ٹیکسی والے نے جب دیکھا کہ کوئی شخص ہسپتال جانے

پر تیار نہیں ہے تو اس نے ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے زخمی نوجوان کو اپنی ٹیکسی سے اٹھا کر دوبارہ سڑک کے کنارے ڈال دیا خدا ہم کو معاف کرے۔ مگر تم لوگوں پر لعنت۔" یہ کہہ کر ٹیکسی والا وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔

نوجوان کا زخمی جسم ایک گھنٹہ تک اسی عالم میں پڑا رہا۔ جو لوگ پہلے سے کھڑے تھے وہ تماشا دیکھ کر چلے گئے تھے۔ اب وہاں نئے لوگ آ گئے تھے اور ایک دوسرے سے اس حادثہ کے متعلق استفسار کر رہے تھے۔ ہر شخص اپنی گردن ہلا ہلا کر لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا۔ ساتھ ہی رائے زنی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

معلوم ہوتا ہے کسی چلتی بس سے گر گیا ہے

نہیں بھائی میرا خیال ہے کسی کار والے نے ٹکر ماردی۔

کون سی کار تھی۔؟

مجھے نہیں معلوم۔

کسی نے نمبر نوٹ نہیں کیا۔؟

عجیب زمانہ ہے، بے چارہ کتنی دیر سے پڑا ہے، کسی نے ہسپتال تک نہیں پہنچایا۔

میاں یہ سب قیامت کے آثار ہیں، قیامت کے، کار والے تو اپنے کو خدا سمجھتے ہیں۔ سالا غریب کو مار کر فرار ہو گیا۔

خدا ایسی موت کسی کو نہ مارے۔

"ابھی مرا نہیں، زندہ ہے، تم پولیس والوں ہی کو خبر کر دو۔"

"اس نے مجھے دھر لیا کہ تم بتاؤ ایکسیڈنٹ کیسے ہوا تو میں کیا جواب دوں گا۔ مجھے پھنسوانا چاہتے ہو، ایں۔"

زخمی نوجوان کے جسم کا سارا خون دھیرے دھیرے نکل کر سڑک کو رنگین کر چکا تھا۔ اب اس کے جسم کی پھڑکن بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اس کا سارا جسم کورے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ آنکھیں دھندلی ہو گئی تھیں۔ ہاتھوں کی انگلیوں میں ذرا ذرا سی جان باقی تھی۔ جو بھنبھناتی ہوئی مکھیوں سے کبھی کبھی ہل جاتیں۔

اتنے میں بھیڑ کو چیرتا ہوا ایک ٹریفک کانسٹیبل وہاں پہنچ گیا۔ ہائیں یہ تو ایکسیڈنٹ کا کیس معلوم ہوتا ہے۔

کانسٹیبل کو دیکھ کر آگے کھڑے ہوئے لوگ آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ کانسٹیبل نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے لوگوں سے سوال کیا۔ اس حادثہ کا کوئی عینی شاہد موجود ہے۔؟

یہ جیسے ہی، ایٹم بم تھا۔ جو بھیڑ کے درمیان میں زوردار دھماکہ سے پھٹا تھا۔ لوگ انتہائی سراسیمگی کے عالم میں اپنی جگہ چھوڑ کر پسپا ہو گئے۔ کانسٹیبل کے ہونٹوں پر انتہائی حقارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ اب وہ تحکمانہ انداز سے ایک ٹیکسی رکوا کر زخمی نوجوان کو اس میں ڈال رہا تھا۔ انسانی ہاتھ کا لمس محسوس کر کے زخمی کا جسم آخری بار پھڑکا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔

تقریباً پانچ چھ گھنٹوں کے بعد ورثا کو اس حادثہ کی اطلاع ملی۔ وہ بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے تو لاش پوسٹ مارٹم کے انتظار میں باہر اسٹریچر پر پڑی تھی۔ ہسپتال کے ایک ملازم نے جواب دیا۔ سرجن موجود نہیں، صبح پوسٹ مارٹم ہو گا۔"

"صبح، صبح تو بہت دیر ہو جائے گی"۔ ورثا میں سے ایک شخص نے کانپتی آواز میں کہا۔ "اس وقت تک تو لاش کسی قابل نہ رہے گی۔"

"پھر میں کیا کروں، یہ تو روز کا قصہ ہے، آخر ڈاکٹر ۲۴ گھنٹے یہ کام کرنے سے تو رہے۔"

"بھائی تم کچھ کرو، ایک نوجوان لڑکا موت کے منہ میں پہنچ گیا۔ بس پر اس کی لاش کی اتنی بے حرمتی۔"

"اس کے ماں باپ کو تو غش آرہے ہیں۔ بھائی اللہ کے واسطے تم انتظام کر دو۔

"بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو سوتے میں سے اٹھانا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔ صرف مریض کو پرائیویٹ

مجھے کیا پڑی ہے کہ
دوسرے کے معاملہ میں
ٹانگ اڑاؤں، عدالتوں
اور پولیس کا رگڑا
کون کھائے گا

دیکھنے کے لئے پچاس روپے لیتے ہیں اور یہ تو پوسٹ مارٹم کا کیس ہے۔ کم سے کم ڈیڑھ سو لیں گے، بولو منظور ہے۔"

"ڈیڑھ سو، ڈیڑھ سو" ورثا میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ان کی پیشانیاں عرق آلود ہو گئیں۔ ہاتھ پاؤں میں کپکپی طاری ہو گئی۔

"اتنے سارے روپے کہاں سے آئیں گے۔؟"

"ہاں بھئی تو بہت بڑا خرچ نکل آیا۔ ابھی کفن دفن کا بھی انتظام کرنا ہو گا۔ بڈھے کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو گی۔"

وہ لاش سے دور ہٹ کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔

"اتنے روپے تو ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اگر کہیں سے انتظام کیا جائے تو واپسی کی کون ضمانت دے گا۔ لڑکا بھی بے کار تھا۔ گھر میں ایسی کوئی چیز بھی نہیں ہے جسے فروخت کر کے قرضہ چکا دیا جائے۔"

"پھر کیا کیا جائے۔؟"

"ہاں، اب کیا کیا جائے۔؟"

اس کا جواب ان کے پاس نہ تھا۔ انہوں نے ایک نظر لاش کو دیکھا، پھر ہسپتال کے ملازم کو دیکھا جو ان کے جواب کا منتظر تھا۔ ورثا معنی خیز انداز سے ایک دوسرے کو تکتے ہوئے اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھے۔

ان میں سے ایک چگی داڑھی والے شخص نے بڑے معنی خیز انداز میں آہستہ آہستہ اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا "مرنے والا زندہ ہونے سے تو رہا۔ اب اسے ہم دو ڈھائی سو روپے خرچ کر کے دفن کریں یا ہسپتال والے اسے لاوارث قرار دے کر کہیں دبا دیں۔ برابر ہے۔"

اس الجھن کا سرا مل گیا تھا۔ سب کے اترے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔ ہاں، ہاں یہ ٹھیک ہے، بڑی مناسب تجویز ہے۔" اس کے بعد وہ ایک ایک کر کے ہسپتال کے آہنی پھاٹک سے سر ہنوڑا کر باہر نکل گئے۔ لاش اپنے ورثا کی منتظر رہی۔ میلی خون آلود چادر پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

ہسپتال کا ملازم ان لوگوں کو جاتے ہوئے بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ حقارت سے بڑبڑایا۔ "سالے ڈیڑھ سو روپے کی خاطر لاش چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہیں، کیا زمانہ آگیا، اخ تھو۔!

الفتح

سیاسی رہنما

۳ جنوری ۱۹۷۴ کو

کل اور آج

(اوّل) "وائٹ پیپر" شائع کر رہا ھے

علمائے دین

ابوالاعلیٰ مودودی • غلام غوث ہزاروی • مولوی محمد حسین
مولوی صالح محمد • صاحبزادہ فیض الحسن • زاہر القاسمی • مفتی محمود
ارشاد الحق تھانوی • شاہ احمد نورانی • احتشام الحق تھانوی

سیاسی رہنما

غفار خاں، عبدالولی خان، ایئر مارشل اصغر خان، ممتاز دولتانہ، اکبر بگٹی، خان عبدالقیوم خاں
ایوب کھوڑو، مشتاق گورمانی، چوہدری محمد علی، نورالامین، پیر علی محمد راشدی، مخدوم زادہ حسن محمود
نبی بخش زہری، قادر بخش زہری، جام صاحب آف لسبیلہ، جام صادق علی، میر اعجاز علی تالپور
میر غوث بخش بزنجو۔

یہ علمائے دین اور رہنمایان ملک و قوم ہیں، یہ کل کیا تھے اور آج کیا ہیں، ماضی، حال کا آئینہ، اندرونی کہانیاں، ظاہری سج دھج اور دعووں سے مختلف ہیں۔

مَعلومات ھی مَعلومات

آپ بھی ان کے بارے میں لکھنا چاہتے ہوں تو ۱۰ دسمبر تک ہمیں ارسال کر دیجئے

صفحات ۲۰۰	قیمت پانچ روپے

آج ہی اپنی کاپی بک کرا لیجئے

اس سلسلے کی جلد دوم کی اشاعت کا اعلان بعد میں کیا جائے گا

سرسید گرلز کالج
میں ہنگامہ

الفتح رپورٹ

انیتہ غلام علی ٹولہ، سلمیٰ زمن کی مقبولیت سے فائدہ اٹھا رہا ہے

سرسید کالج غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دیا گیا۔

- اساتذہ نے طلباء کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے مطالبات بھی پیش کر دیتے۔
- معزز اساتذہ اپنے مطالبات منوانے کے لئے ایک بار پھر سڑکوں پر نکل آتے۔

پچھلے دس دن سے سرسید کالج ہنگاموں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ جلسہ، جلوس اور ہڑتالوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ آخر کیوں؟ ہر باشعور شہری کے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہے۔ کہ ابھی نیا تدریسی سال ٹھیک سے شروع بھی نہیں ہوا کہ یہ ہنگامے شروع ہو گئے ہیں۔ اور پھر ہر ہنگامہ آخر کار سرسید گرلز کالج ہی سے کیوں شروع ہو رہا ہے، دوسرے تدریسی اداروں میں یہ چہل پہل کیوں نہیں۔؟

ان سوالوں کے جوابات کے لئے ہمیں سرسید گرلز کالج اور اساتذہ کی تنظیم ویسٹ پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن میں جو قریبی رشتہ ہے ہمیں اس کا تجربہ کرنا پڑے گا۔

سرسید گرلز کالج شروع ہی سے ویسٹ پاکستان کالج ایسوسی ایشن کی ساری سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اس تنظیم کے تمام اجلاس یہیں ہوتے تھے اور ہو رہے ہیں۔ مسز سلمیٰ زمن پرنسپل سرسید گرلز کالج ہمیشہ سے ڈبلیو، پی، سی ٹی، اے کی سرپرست اور مربی رہی ہیں۔ اس کالج کے دوسرے اساتذہ بھی اس تنظیم میں فعال کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جاتے تو بے جا نہ ہو گا کہ گزرے دور کی پرائیویٹ انتظامیہ شاید ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کو پنپنے کا موقع ہی نہ دیتی اگر مسز سلمیٰ زمن اس تنظیم کو سرسید گرلز کالج میں پناہ نہ دیتیں، یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسز سلمیٰ زمن بذاتِ خود ان ہنگاموں کے خلاف ہیں۔ لیکن ٹیچرز ایسوسی ایشن کے مفاد پرست عناصر ان کے تبادلہ کو EXPLOIT کر رہے ہیں۔

مسز نعیم شاہ اور سرسید گرلز کالج کی دوسری اساتذہ اپنے پرنسپل کی ہمدردیاں دیکھ کر پوری قوت سے اس جماعت کو فعال اور مؤثر بنانے میں لگ گئیں۔ کالجوں کو نیشنلائز کرنے سے لے کر اساتذہ کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ کا حل ڈھونڈنے کے لئے سرسید گرلز کالج کا ہال اور لان استعمال ہوتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی موجودہ قیادت کے ذہن میں ایک غلط بات بیٹھ گئی کہ اگر مسز سلمیٰ زمن یا مسز شاہ تبدیل ہو کر کہیں اور چلی گئیں تو سرسید کالج نے جو کردار ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کی نشوونما میں ادا کیا ہے، اس سے یہ تنظیم یکسر محروم ہو جائے گی۔ اور ہو سکتا ہے کہ حکومت نئی پرنسپل پر اثر انداز ہو کر ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کو ہمیشہ کے لئے سرسید کالج کی آغوش سے محروم کر دے۔

یہ خوف تھا جس نے موجودہ قیادت کو سرسید گرلز کالج کی طالبات کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا۔ ایک معقول پرنسپل کے تبادلہ پر طالب علموں کا ردعمل تو سمجھ میں آتا ہے لیکن ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کا اس مسئلے کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لینا سمجھ میں نہیں آتا۔

آیئے ذرا اور تفصیل میں جائیں۔ اس سارے ہنگامے



طالبات نے سرسید گرلز کالج کی عمارت پر سیاہ پرچم لگا دیا

دوسرے پرنسپلوں اور پروفیسروں کے تبادلے پر

ٹیچرز ایسوسی ایشن کیوں خاموش رہی ؟

سب سے پہلے ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کی مجلسِ عاملہ کی میٹنگ ہونا طے پا چکا تھا۔ لیکن وقتِ مقررہ پر کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے میٹنگ ملتوی ہو گئی۔ جب یہ ملتوی شدہ میٹنگ دو دن بعد منعقد ہوئی تو بجائے پچھلی میٹنگ کے ایجنڈے کے سب سے پہلے یہ مسئلہ اٹھایا گیا کہ مسز سلمیٰ زمن کو کسی صورت ٹرانسفر نہیں ہونے دیا جائے گا اور اس کے لئے ہم خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے۔ (اس دوران ٹرانسفر آرڈرز آ چکے تھے) اس پر میٹنگ میں ایک ہنگامہ ہو گیا، کچھ سمجھ دار اور متوازن ذہن لوگوں نے اس بات پر دو اعتراض کئے۔

۱۔ ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کے منشور کے تحت کوئی پرنسپل اس تنظیم کا ممبر نہیں ہو سکتا۔ اس طرح مسز سلمیٰ زمن کے معاملے میں ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کا کسی قسم کا مؤقف اختیار کرنا بالکل غلط ہے۔

۲۔ دوسرے اگر یہ ٹرانسفر ذاتی دشمنی یا رنجش کی بنا پر کی گئی ہے تو اس سے پہلے دسیوں پرنسپل صاحبان اور لیکچرارز کی تبدیلی بھی ہو چکی ہے، یا تو ان سب لوگوں کی ٹرانسفر کے خلاف آواز اٹھائی جاتی اور یا پھر حکومت کے انتظامی معاملات میں دخل دینے کی بجائے پہلے کی طرح خاموشی اختیار کی جاتی۔

ایک آواز اور بھی بلند ہوئی کہ ہڑتال اور مظاہروں جیسا اہم فیصلہ اس بے کورم میٹنگ کی بجائے جنرل باڈی میٹنگ میں کیا جاتے۔

اس دوران سارے قوانین کو بالائے طاق رکھ کر سرسیّد گرلز کالج کی وہ اساتذہ جو کہ مجلس عاملہ کی ممبر نہیں تھیں زبردستی بیٹھی رہیں۔ ان کے علاوہ بیسیوں گرل اسٹوڈنٹس کو بھی وہاں موجود پایا گیا۔

اس بے کورم میٹنگ میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا لیکن دوسرے دن اخباروں کو جو بیان دیا گیا وہ سراسر جھوٹا اور بے بنیاد تھا۔ یعنی مجلسِ عاملہ میں یہ ریزولیوشن پاس ہو گیا ہے کہ اساتذہ ان تبدیلیوں کے خلاف (اب بیسیوں دوسری ڈیمانڈز بھی شامل کر دی گئیں)، سرسیّد گرلز کالج کی طالبات کا ساتھ دینگے۔

دراصل سینیرٹی لسٹ اور پروموشنز کے بعد یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہر کالج میں پروفیسر صاحبان، اسسٹنٹ پروفیسران اور لیکچررز کا جو کوٹہ مقرر ہے اساتذہ کا تقرر اس حساب سے کیا جاتے۔ اس کے لئے تبدیلیاں اشد ضروری ہو جاتی ہیں۔ ورنہ یہ ہو گا کہ کسی کالج میں دس پروفیسر اور اسسٹنٹ پروفیسران ہیں اور کسی میں ایک بھی نہیں یا محض دو ایک ہیں۔ یہ آج بھی ہونا ہے اور کل بھی۔ یہ ایک خالصتاً انتظامی مسئلہ ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ حکومت ہر الزام سے

ویسٹ پاکستان کالج

ٹیچرز ایسوسی ایشن کی

قیادت اور محکمۂ تعلیم

کے حکام کی دھاندلیاں

بری الذمہ ہے، کوتاہیاں حکومت سے بھی ہوتی ہیں، اساتذہ کے بہت سے مسائل ابھی تک سُرخ فیتے میں پڑے پڑے ہیں لیکن کسی تنظیم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسائل کو حل کرنے کی بجائے انہیں اور الجھانے کی کوشش کرے۔ حکومت کیساتھ تصادم سے مسائل حل نہیں ہوتے اور بڑھ جاتے ہیں۔ دراصل ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کی موجودہ قیادت نے از خود اقربا پروری اور دوست نوازی کے چکر میں بیورو کریسی سے مل کر وہ وہ دھاندلیاں کروائی ہیں کہ اب مذاکرات کے ذریعے حکومت پر دباؤ ڈال ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ افسران کے سامنے اپنی بدعنوانیوں کی وجہ سے ان کے سر جھکے ہوتے ہیں۔ ان بدعنوانیوں کی پوری تفصیل کی تو اس مضمون میں گنجائش نہیں لیکن پھر بھی آگے چل کر چند مثالیں پیش کی جائیں گی۔ حکومت کے افسران بھی اس سازش میں ملوث تھے، یوں کہیے کہ جب تک دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتی تھیں جھونکتی رہیں لیکن جب مفادات ٹکرا گئے تو پھر ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کی قیادت نے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لئے ٹرانسفرز، دیگر ڈیمانڈز کا پلندہ ہاتھوں میں تھاما اور سڑکوں پر نکل آتے۔

ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کی ڈیمانڈز ہر ٹیچر کی ڈیمانڈز ہیں۔ اس گروپ کی بھی جسے غدّار اور حکومت کا پٹھو جیسے ناموں سے نوازا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہر استاد، اس کا تعلق کسی بھی ادارے سے ہو وہ ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کے ساتھ ہے۔ لیکن جو قیادت ان ڈیمانڈز کو لے کر آگے بڑھ رہی ہے اس پر سے بہت سارے اساتذہ کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ کیونکہ اب وہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ قیادت اپنی ذاتی منفعت کے لئے ایک بار پھر ان کا سودا کرنے پر تیار ہو جاتے گی۔ یہ قیادت ۱۹۶۷ء سے اساتذہ پر مسلط ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ لیکن تفصیل میں جانے سے پہلے اگر تنظیم کی تاریخ پر ہلکی سی روشنی ڈال لی جاتے تو نامناسب نہ ہو گا۔

۱۹۶۲ء کے اوائل میں چند سینیئر اساتذہ نے جن میں لطیف احمد خاں، پروفیسر شمیم سوری اور پروفیسر اسرار احمد شامل تھے، اساتذہ کے لئے ایک تنظیم کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کیا۔ اس سلسلے میں دوسرے ہم خیال اساتذہ سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد لاہور میں ایک کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا، اور اس طرح ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کی بنیاد پڑی۔ حسنین کاظمی اس کے صدر ہوتے۔ ۱۹۶۶ء تک یہ تنظیم اپنا حلقۂ اثر وسیع کرتی رہی۔ ہر کالج میں یونٹ قائم کئے گئے، اور اساتذہ کے بنیادی مسائل کو سلجھانے کی پُرامن کوششیں جاری رہیں۔ اس دوران میں اس تنظیم نے خاصا CONSTRUCTIVE کام کیا۔ اور انہی دنوں پُروقار اور مدبّر قیادت کی بنا پر اس کی جڑیں مضبوط ہوئیں، اور اسے اساتذہ کی واحد نمائندہ جماعت کا درجہ ملا۔

ایک تھرڈ کلاس استاد کو سنیارٹی لسٹ میں ٹانک دیا گیا

موقع پرست قیادت مخالفین کو مقدمے بازی میں اُلجھا دیتی ہے

۱۹۶۶ء میں کراچی ریجن میں مصطفےٰ احسنین اور مسِ انیتا بالترتیب صدر اور نائب صدر منتخب ہوئے، شروع میں ہی ذاتی مفاد اور جاہ پسندی کی روش نے صدر اور نائب صدر کے درمیان اختلافات کی خلیج حائل کر دی۔ کراچی کانفرنس میں یہ اختلافات کھل کر سامنے آئے، اور اس طرح پہلی بار ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے گروہ بندی کا شکار ہوئی۔ اس کے بعد مصطفےٰ احسنین اور مسِ انیتا کبھی تو یکجان دو قالب ہو جاتے اور کبھی ایک دوسرے کے جانی دشمن؛ یہ کھیل دراصل مفادات کا تھا۔ جب مفادات ٹکراتے تو مصطفےٰ احسنین اور مس انیتا ایک دوسرے کی صورت سے بے زار اور نوبت گالی گلوچ تک آ پہنچتی تھی۔ لیکن جوں ہی مفادات ایک ہوتے دونوں مسِ انیتا کی گاڑی میں یکجا بیٹھے مسکراتے نظر آتے تھے۔

۱۹۶۶ء میں جوں ہی مسِ انیتا کراچی ریجن کی صدر منتخب ہوئیں ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے ہنگاموں کی آماجگاہ بن گئی۔ اس کی کچھ نفسیاتی وجوہات بھی ہو سکتی ہیں لیکن یہ تو اظہر من شمس ہے کہ مس انیتا اپنی شخصیت اور لیڈر شپ کو منوانے کے لئے ہمیشہ سے ہنگاموں کی مرہونِ منت رہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی سیاسی شخصیت محض ہنگاموں، ہڑتالوں اور مظاہروں کی پیداوار ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اس سال جب ساری قوم آمرِ مطلق کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ گلی گلی بنیادی حقوق کی دہائی مچی۔ ہر فرد ذاتی مفاد کو ایک طرف رکھ کر اس قومی جنگ میں کود پڑا تو مسِ انیتا سے درخواست کی گئی کہ وہ چند کالجوں میں تنخواہ نہ ملنے پر جس ہڑتال کی فکر میں ہیں اسے چھوڑ کر اس قومی تحریک کے ساتھ چلئے تو ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ قوم زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی اور اساتذہ کی قیادت صرف اپنے حواریوں کی چند مہینے کی تنخواہ کے مسئلہ سے باہر نہ نکل سکی۔ طوعاً و کرہاً ۵، ۸، ۱۱ کالج لاہور سے مس انیتا کی قیادت میں قومی تحریک کی حمایت میں ایک جلوس نکالا گیا لیکن دو سو گز کے فاصلے پر ایک پولیس انسپکٹر اور چند کانسٹیبلز کو دیکھ کر واپس لوٹ آیا اور زندہ دلانِ لاہور جو اس جلوس کے لئے پھول اور ہار لئے مال روڈ پر منتظر تھے۔ وہیں سوکھتے رہے۔ اور جب دوپہر ڈھلنے لگی تو وہ اپنے مرجھائے ہوئے پھولوں کو پاؤں تلے روند کر اساتذہ کو گالیاں دیتے ہوئے گول باغ میں جا جمع ہوئے۔ ۱۹۶۹ء کی تحریک بھی بجھی سی صرف ذاتی مفاد اور لیڈری چمکانے کے لئے چلتی رہی اور ملک میں جو آگ لگی تھی اس کے شعلے ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کی قیادت کو سرے سے نظر ہی نہ آئے۔ خود غرضی کا غلاف بہت دبیز تھا۔

کراچی ریجن میں ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کے انتخابات میں جتنی دھاندلیاں ہوتی ہیں وہ ایک الگ داستان ہے۔ ممبر سازی کی آخری تاریخ کے بعد بھی اپنے حواریوں کی خفیہ طور پر ممبر سازی ہوتی رہتی ہے۔ رائے دہندگان کی ایک ایسی بڑی تعداد ہر سال الیکشن میں حصّہ لیتی ہے، جس نے سرے سے سالانہ چندہ ہی نہیں دیا ہوتا، یہ لوگ ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کے ممبر ہی نہیں ہوتے انہیں صرف انتخابات کے دوران استعمال کیا جاتا ہے۔ جب کبھی مخالف گروپ برسرِ اقتدار آیا تو اسے مقدمے بازی کے ذریعے عضوِ معطل بنا دیا گیا۔ اس طرح مہینوں مجلسِ عاملہ کو غیر فعال رکھا گیا۔ اس گروہ کو مالی تحفظ حاصل ہے۔ (اس کا ذکر آخر میں آئے گا) اور غریب اساتذہ عدالتوں میں ان کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اکثر اوقات کلاس سے بلکہ کالج ہی سے غیر حاضر رہتے ہیں۔ ان کے پاس سیاسی ہتھکنڈوں کے لئے بے پناہ وقت ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ قیادت اساتذہ کے مسلسل استحصال کے باوجود ابھی تک ان پر مسلّط ہے، اساتذہ کی اکثریت اپنی روایتی شرافت کی وجہ سے ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے سے کسی قسم کا سروکار ہی نہیں رکھتی۔ اس کا منہ بولتا ثبوت انتخابات اور جنرل باڈی کی میٹنگ ہیں، ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کے مطابق اس کے ممبران کی تعداد بارہ سو کے قریب ہے۔ پچھلے انتخابات میں ووٹ کاسٹ کرنے والے ممبر کی کل تعداد ۴۰۰ سے آگے نہ جا سکی۔ آج کے ہنگاموں میں جو ہنگامی میٹنگیں ہو رہی ہیں ان میں تعداد سرسید گرلز کالج کی طالبات کو بھی شامل کر کے تین سو سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ جمعرات ۲۲ نومبر کے جلوس کی نفری بھی ڈھائی تین سو سے زیادہ نہ تھی حالانکہ اس میں اسکول کے اساتذہ بھی کچھ شامل تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کے ۱۲۰۰ ممبران کو اس تنظیم سے کتنی دلچسپی ہے

۱۹۷۲ء میں مس انیتا سندھ کی صدر منتخب ہوئیں۔ ان انتخابات میں جو دھاندلیاں ہوئیں اس سے اساتذہ کے سر شرم سے جھک گئے اور اس طرح تنظیم کے معاملات میں ان کی دلچسپی اور بھی کم ہو گئی۔ ان انتخابات کے دوران ۴۶ یونٹوں میں سے صرف ۳۰ مخصوص یونٹوں کو انتخابات کی اطلاع دی گئی اور انہی ۳۰ یونٹوں کے نمائندوں نے انہیں منتخب کیا۔ موجودہ سیکریٹری اعلانیہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں کہ ہم مخالفین کو مجلس عاملہ کی میٹنگ کی اطلاع نہیں دیتے اور نہ دیں گے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجلسِ عاملہ اور مجلسِ قائمہ میں ان کے مخالفین کی اکثریت ہے جسے وہ کسی صورت برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

انتخابات کی نگرانی کا ٹھیکہ احسان اللہ اور مسٹر نعیم شاہ کو عطا کیا گیا اور اب تک یہ دونوں حضرات پوری غیر ذمہ داری سے یہ ذمہ داری پوری کر رہے ہیں۔ ان دھاندلیوں کا انعام جو ان لوگوں کو دلایا گیا کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

۱ - احسان اللہ صاحب کو جو ایس، ایم کالج میں جغرافیہ کے استاد ہیں سرکاری طور پر اجازت دلائی گئی کہ وہ کے، ڈی، اے کے ٹاؤن پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں معقول مشاہرے

جنرل باڈی میں آج تک سالانہ چندے کے حسابات پیش نہیں کئے گئے!!

پر کام کرسکیں۔ خود مس انیتا سارے گورنمنٹ رولز کے خلاف این، ایم کالج میں سروس کرنے کے ساتھ ساتھ ریڈیو پاکستان سے بارہ سو روپیہ ماہوار پاتی ہیں۔

۲ - مسز نعیم شاہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے فرمایا "میں ڈبلیو، پی، ٹی، سی، اے اور ڈبلیو، پی، ٹی، سی، اے مسز نعیم شاہ ہے"۔ محض اتنی سی بات پر کہ انہیں پی، ای، سی، ایچ، ایس کالج میں انگلش میڈیم طالبات کو پڑھانا پڑے گا جس کی وہ اہل نہیں ہیں، یہ سارا ہنگامہ کھڑا کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے دسیوں دوسرے اساتذہ کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اس میں سے کئی لوگ ہماری اس ہمدرد قیادت کے ذاتی عناد اور سیاسی دشمنی کی وجہ سے دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ان کے خلاف آج بھی کوئی آواز نہیں اٹھائی جا رہی۔ شاید اس لئے کہ کہیں ڈبلیو، پی، ٹی، سی، اے کی قیادت کی دھاندلیوں کا بھانڈا نہ پھوٹ جاتے۔ ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کے عہدہ داران اپنے آپ کو، اپنے خوابوں کو ہمیشہ نوازتے رہے۔ اور دوسرے اساتذہ کے بنیادی مسائل حل کراتے وقت خاص طور پر ذاتی مفادات کا خیال رکھا گیا۔ ان بدعنوانیوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ صرف چند مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

۱ - نبی احمد جعفری صاحب کو جن کے تعلقات موجودہ قیادت سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں اور سرسید کالج کے بند ہو جانے پر اپنے کالج میں (جناح کالج)، ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کی جنرل باڈی میٹنگ کا اہتمام کرتے ہیں پرنسپل بنوانے کے لئے جناح کالج کے پرنسپل کا تبادلہ کروایا گیا۔ اس پر اکتفا نہ ہوئی بلکہ لیاقت کالج کے پرنسپل کا تبادلہ کرانا بھی ضروری سمجھا گیا تاکہ ان کے جانے سے یونیورسٹی سنڈیکیٹ کی جو سیٹ خالی ہوتی ہے اس کے لئے نبی احمد جعفری صاحب کو منتخب کروایا جائے۔

۲ - ۱۹۷۲ء کے صدارتی انتخاب میں مس انیتا کا ہارنے والا امیدوار سید کاظم رضا نبی باغ کالج کا پرنسپل بنوایا گیا۔ حالانکہ ان سے سینئر اساتذہ موجود ہیں۔

۳ - قاضی سعید صاحب کو جو نائب صدر مس صبیحہ قاضی کے بھائی ہیں۔ تھرڈ کلاس ایم، اے ہونے کے باوجود سنیارٹی لسٹ میں رکھوایا گیا۔ جبکہ دوسرے سارے ایسے اساتذہ کی الگ لسٹ بنی۔

۴ - سٹی کالج کے مقبول پرنسپل جمیل جورانی صاحب کو کئی دوسرے اساتذہ کی موجودگی میں گالیوں اور دھمکیوں سے نوازا گیا۔ اور مس انیتا نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا "تم اب ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کا اگلا نشانہ ہو"۔ جمیل جورانی صاحب اس واقعہ کی تحریری رپورٹ ڈائریکٹر ایجوکیشن کو دے چکے ہیں۔

بے ضرر اور سیدھے سادے اساتذہ کو فاشی ہتھکنڈوں سے مرعوب کرنے کی یہ رسم نئی نہیں ہے۔ جس کسی نے موجودہ قیادت کے خلاف زبان کھولنے کی کوشش کی اسے فوراً دھمکی دی گئی کہ اس کا تبادلہ کروا دیا جائے گا۔ کئی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں ان دھمکیوں کو عملی شکل بھی دی گئی۔ صوبہ سندھ کے سیکرٹری جناب مصطفےٰ احسین صاحب کی ترقی بڑے انوکھے طریقے پر ہوئی۔ وہ ۱۹۶۷ء تک انفارمیشن کے محکمہ میں ملازم رہے۔ اور محض اعزازی طور پر نبی باغ کالج میں پڑھاتے رہے اگر کہیں جزوقتی نوکری مل جاتی تھی تو وہ بھی کر لیتے تھے۔ لیکن مس انیتا نے ان کی یہ اعزازی اور جزوقتی سروس فل ٹائم گنوا کر انہیں ترقی دلوائی اور ان کے لئے سنیارٹی لسٹ میں خاص جگہ بنانی پڑی۔

موجودہ صدر طاہر صاحب تھرڈ کلاس ایم، اے تھے۔ انہوں نے بعد میں اپنی ڈویژن بہتر بنائی۔ انہیں بھی ترقی دے کر اسسٹنٹ پروفیسر بنا دیا گیا حالانکہ ایسے دوسرے اساتذہ کو URDU QUALIFIED لسٹ میں رکھا گیا ہے۔

ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کے عہدیداران کے کارناموں کی فہرست بہت ہی طویل ہے، جہاں تک حسابات کا تعلق ہے ۱۹۶۷ء سے آج تک کبھی بھی جنرل باڈی میں سالانہ چندے کے حسابات پیش نہیں کئے گئے۔ کالج ٹیچرز کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے نام پر ۵۵۰۰۰ جمع ہوا۔ اس کے سود کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ کہاں گیا۔

موجودہ حالات میں حکومت نے جس تدبر اور صبر کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ طالبات کا مطالبہ مانتے ہوئے پروفیسران کے تبادلے کے احکام روک دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ مطالبات سراسر ناجائز تھے۔ مسز سلمیٰ زمن بھی رضامند ہو گئی ہیں کہ وہ دس دن کی چھٹی پر چلی جائیں گی۔ اور بعد میں حسبِ منشا۔ ان کا تقرر کر دیا جائے گا۔ حکومت نے مسائل مذاکرات کے ذریعے طے کرنے کی تجویز بھی پیش کر دی ہے۔ اب ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کی قیادت کو شہر میں تعلیمی امن کو مزید تباہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے معصوم طلباء اور طالبات کو بھڑکانے اور کالج بند کروانے کی بجائے ایک صحت مند تعلیمی ماحول واپس لانے کی کوشش میں حکومت سے تعاون کرنا چاہیئے۔ وہ وقت دور نہیں جب معصوم طلباء اور طالبات کو یہ احساس ہو جائے گا کہ چند مفاد پرست اپنی دکان چمکانے کے لئے انہیں استعمال کر رہے ہیں اس وقت ڈبلیو، پی، سی، ٹی، اے کی قیادت کا گریبان ہوگا اور ان طلباء کا ہاتھ۔ بلکہ پتہ چلا ہے کہ کچھ ہاتھ تو اٹھ بھی چکے ہیں۔

انیتا غلام علی
کی قیادت میں
نکلنے والا جلوس
کانسٹیبل کو
دیکھ کر بھاگ
کھڑا ہوا!



باتوں کے خربوزے کی رونمائی

مختار زمن اپنی کتاب "باتوں کے خربوزے" کی رونمائی کے موقع پر تقریر کر رہے ہیں

مختار زمن کے پرزے نہ اڑ سکے!

ذکر جوش کی مے خوری اور صدر کے کافی ہاؤس کے کوٹھے کا

سنتے تھے کہ ہم ۲ر نومبر کو آرٹ کونسل آف پاکستان میں "باتوں کے خربوزے" کی رونمائی ہوگی۔ مختار زمن دولہا بنیں گے۔ اور پیرانِ طریقت، مختار زمن کے پرزے اڑائیں گے۔ سو ہم بھی تماشائے اہلِ کرم دیکھنے گئے۔ مگر بقول مختار زمن "ان کے پرزے نہ اڑ سکے"۔ زمن بہت ڈھیٹ اور عقل کھرے ہیں۔ جو سوچا اور سمجھا اسی کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ کوئی لاکھ زور لگائے ٹس سے مس نہیں ہوتے، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ جب برطانیہ میں بنگلہ دیش کا پروپگنڈہ زوروں پر تھا۔ لندن میں مقیم بعض "پاکستانی دانش ور" بھی بنگلہ دیش کی حمایت کر رہے تھے "زمن، بی بی سی کے ملازم ہونے کے باوجود قراردادِ پاکستان سینے سے چپکائے پھرتے تھے، احباب نے بہت سمجھایا بجھایا، ۱۹۴۰ء اور ۱۹۷۱ء کا فرق بتایا، پس منظر کو پیش منظر میں بدل ڈالا، لیکن زمن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ اور "میں نہ مانوں" کی رٹ لگائی رکھی۔ "پاکستانیت کے جذبے" نے اتنا زور مارا کہ انہوں نے بی بی سی ملازمت اور اپنے پرانے آقاؤں کا وطن چھوڑ دیا۔ اور اے پی پی کی وہی میز اور کرسی سنبھال لی، جو ۱۹۶۹ء تک ان کے زیرِ استعمال تھی۔ پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ بھلا ایسے ڈھیٹ آدمی کے پرزے کون اڑا سکتا ہے۔

رونمائی کی اس تقریب کی ابتدا۔ میں مائیک پر ابنِ انشاؔ کا قبضہ تھا۔ ہم نے سمجھا کہ یہ اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ لیکن تلاوتِ قرآن کے بعد پبلک کے اصرار کے بغیر انہوں نے اپنی جیب سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا اور خربوزوں کی اقسام بتانا شروع کیں، ابنِ انشا۔ عموماً ایسی تقاریب میں شریک ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ آخری مقرر ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ کیونکہ سامعین کا دھیان چائے اور سموسوں کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے، چنانچہ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور صہبا لکھنوی کی بجائے اپنے آپ کو ہی تقریر کرنے کے لئے مدعو کر لیا۔

ان کی حالت یہ تھی کہ آواز بیٹھی جا رہی تھی، گلا خراب ہونے کی وجہ سے دو سُر نکل رہے تھے۔ لیکن سامعین بے سُری آواز کو سننے پر مجبور تھے۔ آخر کار انہیں سامعین پر رحم آ ہی گیا۔ خربوزوں کی اقسام کا ذکر مکمل نہیں کیا۔ بس یوں سمجھ لیجئے "کچھ کہہ نہ سکے اور کچھ کہہ بھی گئے" والا معاملہ رہا۔ مقالے کا افتتاحیہ اور اختتامیہ سنا کر سامعین کو یہ سہولت دی کہ وہ "خالی جگہ" خود پُر کریں! اور جوابات لکھ کر بھیج دیں تاکہ "دخل در معقولات" کے ہفتہ وار کالم میں انہیں شائع کر دیا جائے۔

اس کے بعد نصیر صدیقی آئے، انہیں زمن سے دوستی کا بھی پاس رکھنا تھا اور کچھ "فرنگی تربیت" کا بھی۔ ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ کوئی شخص اپنے مقدر کا خود جج نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ زمن کے فن پر بحث کرنے سے قاصر رہے۔ بلکہ بحث یا تبصرہ کرنے سے انکار ہی کر دیا۔

پھر ابنِ الحسن اسٹیج پر آئے اور اس شان سے آئے کہ بقول مختار زمن "ملک کے دو ٹکڑے ہونے کے باوجود قراردادِ پاکستان ان کے چہرے پر لٹک رہی تھی" اور بقول خود ابنِ حسن "عوام دشمنی کی علامت" یعنی داڑھی سب سے نمایاں تھی۔ اور قراردادِ پاکستان کی طرح بوڑھی ہو چکی تھی۔ سفید بال جھلک رہے تھے۔ ابنِ الحسن کے مضمون میں جوش

کی مے خواری کا ذکر بھی آیا۔ اور سیاستِ دوراں کا شکوہ بھی، صدر کے کافی ہاؤس کے کوٹھے کا تذکرہ تھا اور کراچی پریس کلب کا بھی، انہوں نے اس زمن کا بھی ذکر کیا۔ جو کل ہند و مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا سرگرم رہنما تھا۔ تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا تھا۔ تحریکِ پاکستان اور پاکستان کے مقاصد بتاتا تھا، اور پھر اس زمن کا احوال بتایا جو آج کل سرکاری خبر رساں ادارے اے پی پی کا غالباً سب سے زیادہ تجربہ کار اور پرانا صحافی ہے۔ ابن الحسن کے مضمون میں بھرپور طنز تھا۔ شیرینی اور حلاوت کی بجائے تلخی کا عنصر بہت زیادہ تھا۔

صہبا لکھنوی کو اس تقریب میں اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع نہ مل سکا۔ کیونکہ ابنِ انشا نے خربوزوں کی اقسام گنوانے کے بعد نہایت ہوشیاری سے اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انہیں سونپ دیتے تھے۔

پھر دولہا میاں یعنی مختار زمن کو اسٹیج پر آنے کی زحمت دی گئی۔ انہوں نے لفظ "رونمائی" کے ماخذ پر روشنی

کتاب شائع کرنے کا کفارہ ادا کرنے کے لئے ناشر کو حج پر جانا پڑا

ڈالی، دلہن کی رونمائی سے لے کر ادب کی رونمائی تک کا ذکر کیا گیا اور کہا "ادب کی توانائی رونمائی پر منحصر نہیں ہے۔ اور عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جن کتابوں کی رونمائی ہوتی ہے وہ کچھ عرصے کے بعد اپنا منہ چھپا لیتی ہیں۔ اس کے برخلاف دنیا کے بڑے بڑے مصنفین کی کتابیں جن کی کوئی رونمائی نہیں ہوتی آج بھی زندہ ہیں"۔ مختار زمن کے "باتوں کے خربوزے" کتب خانوں اور اہلِ ادب میں اپنا مقام بناتے ہیں یا ان کا حشر "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" جیسا ہوتا ہے، اس کا جواب مستقبل ہی دے گا۔

زمن نے "رونمائی" کے ذکر کے بعد ایک جست لگائی اور پاکستانی معاشرہ کا ذکر لے بیٹھے، کہا "ہم مغرب سے اپنے مطلب کی چیزیں مثلاً پوپ ریکارڈ، پوپ میوزک، چیونگم" وغیرہ لیتے ہیں لیکن آزادیٔ صحافت مسترد کر دیتے ہیں"۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ صحافی نہیں "فرائض نویس" ہیں۔

زمن کی تقریر کا اختتامیہ "اشتہار نما" تھا۔ خود کو ایک اچھا کاپی رائٹر ثابت کرتے ہوتے انہوں نے پہلے تو چائے اور سموسوں کا ذکر کیا۔ پھر کتاب کی قیمت بتائی اور ساتھ میں یہ ہدایت کہ "ٹیکسال سے کترا کر نہ نکل جائیں"۔ آخر میں یہ سوگن تھا کہ "چلیئے حضرات! ادھر خربوزوں کا ڈھیر ہے اور ادھر چائے، کتاب کی قیمت ایک گیلن پٹرول سے کم ہے۔" ہمارے خیال میں مختار زمن صاحب اچھے کاپی رائٹر تو ہو سکتے ہیں لیکن اچھے سیلز مین نہیں۔ کیونکہ "باتوں کے خربوزے" کی رونمائی ایسے موسم میں کی گئی جب لوگوں کے ذہن سے خربوزے کی مٹھاس بھی اتر چکی تھی۔ یہ تو ایسا ہی ہے

باقی صفحہ ۳۱ پر

قارئین کہتے ہیں

پشاور میں آتش زدگی کے حادثات میں اضافہ

پشاور کہنے کو تو خاصہ معروف اور قدیم شہر ہے اِسکی بعض عمارتیں آج بھی پرانے شہروں کی داستان سناتی دکھائی دیتی ہیں۔ تقریباً ہر بازار اور محلے کے ساتھ کوئی نہ کوئی قصہ یا واقعہ منسلک ہے، شہر ہے کہ روایتوں سے بھرا پڑا ہے مگر ماضی کی یادگاریں اب مٹتی جارہی ہیں پشاور ایک دور سے نکل کر دوسرے دور میں قدم رکھ چکا ہے۔ جدید عمارتیں پشاور کی وضع قطع تبدیل کر کے اِسے نیا چولہ پہنارہی ہیں۔ اِس تمام کچھ کے باوجود اس شہر میں ایک مسئلہ قیام پاکستان سے چلا آرہا ہے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ اس مسئلے کی طرف اب تک توجہ نہیں دی گئی۔ اور یہ مسئلہ ہے گلی محلوں میں بوسیدہ وائرنگ کا۔ اِس مسئلے کو اب تک حل نہ کر کے محکمہ بجلی نے اپنی کارکردگی کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔

پچھلے چند ماہ کے دوران وائرنگ تبدیل کرنے کی تجویز پر عمل درآمد ہوا۔ نئی تاریں لگائی گئیں جنکے معیار کا یہ عالم ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد بیکار ہوگئیں۔ اور ذراسی بارش یا جھکڑ کے دوران یا بعد میں تاروں سے پہلے دھواں اور پھر شعلے نکلنے لگے۔ اور لوگوں کے مکانات بجلی کی اسپارکنگ اور بجلی کی رَو کی مقدار بڑھ جانے کی وجہ سے ایک دفعہ پھر آگ کی زد میں آگئے۔ اِسطرح جو مالی اور اقتصادی نقصان ہوا۔ اُس کی ذمہ داری سراسر محکمہ بجلی پر عائد کی جاسکتی ہے جس کے حکام اپنے فرائض کی بجاآوری سے غفلت برت رہے ہیں۔ اور اِن بوسیدہ تاروں کو نجانے کب تک اِس حال میں رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ امر ظاہر ہے کہ اِن تاروں کی عمرِ عزیز اپنے آخری مراحل میں پہنچ چکی ہے اور محض انہی کی وجہ سے شہر کے کئی حصّوں میں آتش زدگی کی واردات ہوچکی ہیں۔

گذشتہ سال چوک یادگار میں ایک دکان "دی ہیلتھ" میں اِسی ناکارہ وائرنگ کی وجہ سے آگ لگی اور اِس دکان کے علاوہ دوسری دکانیں بھی لپیٹ میں آگئیں۔ مشہور تجارتی مرکز مینا بازار کو بھی آتشزدگی کی ایک ایسی ہی واردات کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سے دوسرے نقصانات کے علاوہ پرائیویٹ طور پر کپڑا چھاپنے والے پانچ کارخانے مکمل طور سے جل کر راکھ ہوگئے۔ یہ آگ بجلی کے اُن ناقص تاروں کی وجہ سے لگی تھی جو سرائے سلیمان کے اوپر سے گذرتے ہیں۔ اِن کارخانوں کے تباہ ہوجانے سے کاریگر جہاں مالی طور پر کمزور ہوتے وہاں اِس آگ سے پچاس پچاس برس پرانے لکڑی کے نادر چھاپے بھی برباد ہوتے کئی کاروباری دکانیں بھی جن میں لاکھوں روپے کا سامان پڑا تھا۔ آگ کی لپیٹ میں آگئیں۔ متعدد خاندان بے گھر اور تقریباً ڈیڑھ سو افراد پر اس آتش زدگی کا بُرا اثر پڑا۔ خوش قسمتی تھی کہ فائر بریگیڈ موقع پر پہنچا، دگرنہ آتشزدگی کا یہ سلسلہ یوں ہی رہتا تو شائد پورے مینا بازار کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔

کریم پورہ بازار کے محلہ جھنڈا بازار میں ایک مکان بجلی کی اسپارکنگ کی وجہ سے جل کر راکھ ہوا۔ اِس مکان میں ایک غریب عورت رہتی تھی۔ جس نے شب و روز محنت کر کے اپنی بیٹی کے لئے جہیز تیار کیا تھا۔ مگر ماں کی آرزوؤں اور بیٹی کی تمناؤں کا خون وائرز کی خرابی کے باعث بڑی آسانی سے ہوا۔

ناقص وائرنگ اور اسپارکنگ کی شکائت محض ایک محلے کی نہیں سارے شہر کی ہے۔ ہر دوسرے تیسرے روز گلی محلوں میں واقع پولز پر تاروں کے درمیان اسپارکنگ کی آنکھ مچولی جاری رہتی ہے جس سے علاقے کے لوگوں کا امن و سکون غارت ہو کر رہ گیا ہے اور وہ دم سادھے چنگاریاں اڑاتی تاروں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ جب وائرز کی خرابی کی شکایت کی گئی تو توجہ نہیں دی گئی اور شکایت کرنے والوں کو جھوٹا دلاسا اور تسلی دیکر رخصت کر دیا گیا شہریوں کے ساتھ یہ کھیل کب تک کھیلا جائیگا؟

(سیّد مہدی حسن۔ پشاور)

حسن ناصر نے خودکشی نہیں کی تھی

حسن ناصر شہید لاہور کے شاہی قلعے میں میرے ساتھ تادمِ شہادت قید تھا۔ ..... یہ غلط ہے کہ اُس نے خودکشی کی ہے۔ حسن ناصر نہایت وجیہہ اور خوش مزاج انسان تھا۔ مَیں اردو کے پرچوں میں مٹھائی لپیٹ کر صفائی والے کے ہاتھ ان کے پاس بھیجتا تھا، ان کے دو خط زیرِ اثر سپاہیوں کے ذریعہ دکن اور کراچی پہنچے، ان کی والدہ کے پاس۔

جب میں لاہور ڈسٹرکٹ جیل پہنچا یا جارہا تھا تو ہمارا جیلر جو حاجی بھی تھا اور اپنے کو میرا بہت معتقد ثابت کرتا تھا مجھے حسن ناصر کے کمرے میں لے گیا اور وہاں بان کی ایک پتلی سی رسی مجھے دکھائی (کہ جس سے حسن ناصر نے اپنے لئے موت کی رسی بنائی تھی) وہ رسی بودی کمزور تھی جو ایک آدمی کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتی، ایک معمولی میخ کے کھونٹے سے لٹکی دکھائی اور کہا حسن کی قاتل یہ رسی ہے وہ رسی زبانِ حال سے اس بپتا کی تردید کرتی تھی۔ مشہور مثل ہے کہ۔ دروغ گو را حافظہ عاری میباشد۔

(ڈاکٹر سنجری۔ پشاور)

حسن ناصرؔ انقلاب کی علامت بن گیا

حسن ناصر مرحوم کی یاد میں الفتح کی اشاعتِ خصوصی پیشِ نظر ہے۔ آپ نے جس عقیدت سے پاکستان کے "شہیدِ انقلاب" کو خراج پیش کیا ہے۔ وہ یقیناً اُن نوجوان کارکنوں کے لئے باعثِ حوصلہ افزائی و تقلید ہے جنہوں نے سیاسی عمل کو تیز تر کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیا ہے اور لے رہے ہیں۔ حسن ناصر نئی نسل کے لئے ایک ایسی زندہ و تابندہ علامت بن چکا ہے جس کی روشنی نے انقلاب کی شاہراہ کو اپنے لہو کی سرخی سے منور کیا ہے۔ آپ نے اپنے اداریے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کو ابھی بھی اور بعد میں بھی مسلسل دہرانے کی ضرورت ہے۔ خان ناہید نواز اور فارخ بخاری کی نظمیں بہت ہی خوب ہیں۔ عبداللہ ملک کا مضمون اور جدید ترمیم پسندیت پر منہاج برنا کا مقالہ دعوتِ فکر دیتا ہے۔ حسن ناصر کا مکمل مقالہ اپنی انفرادیت، حقیقت پسندانہ نکتہ نظر اور ارتقا کے سائنسی عمل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ پتہ نہیں ہمارے ملک میں نام نہاد بائیں بازو کی دکانیں اور ان پر بیٹھنے والے مہاجنوں کی دکانداریاں کب تک قائم رہینگی

بہت عزیز ہو، لیکن، شکستہ دل یارو
تم آج یاد نہ آؤ کہ جشن کا دن ہے۔

(شاہد علی نقوی ایڈووکیٹ لاہور)

مکڑوال کے مزدوروں کو بناسپتی گھی کا کوٹہ نہیں دیا گیا

خیبر سے کیماڑی تک

شفیع اللہ نیازی

مکڑوال

میانوالی کا ایک تجارتی مرکز اور ملک کا ایک اہم کاروباری علاقہ ہے۔ قدرت نے اس علاقہ کو قیمتی معدنیات سے مالا مال کر رکھا ہے۔ یہاں بڑے پیمانے پر کوئلہ دریافت ہوا ہے۔ اور کوئلہ کی مختلف کانوں میں چار ہزار کے لگ بھگ کان کن، اور دیگر عملہ ملک و قوم کی خوشحالی کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔ ملکی کوئلہ کی ضروریات زیادہ تر اسی علاقہ سے پوری کی جارہی ہیں۔ کیونکہ ملک بھر میں سب سے زیادہ کوئلہ اسی علاقہ سے نکالا جارہا ہے۔ مکڑوال کی کانوں سے ہر روز چھ سو سے سات سو ٹن کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ اور پی آئی ڈی سی کے منافع کا زیادہ تر دارومدار انہی کوئلہ کی کانوں پر ہے۔ کیونکہ پی آئی ڈی سی کو مکڑوال کالریز سے روزانہ تقریباً سوا لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ یہاں کی زیادہ تر آبادی کوئلہ کی کانوں میں کام کر کے گزراوقات کرتی ہے۔

مزدور اور گھی

مکڑوال اگرچہ معدنی لحاظ سے ملک کا اہم علاقہ ہے لیکن اس کے باوجود یہاں کے عوام گوناگوں مسائل سے دوچار ہیں۔ وہ ابھی تک گھی کی شکل دیکھنے سے محروم ہیں۔ یہاں یہ بات حیرت انگیز ہے اور قابلِ افسوس بھی، کہ میانوالی کے ہر علاقہ میں گھی کی مسلسل تقسیم اور مکڑوال کے سوا باقی تمام علاقوں کو گھی کا کوٹہ دیا جارہا ہے۔ لیکن یہاں کے مزدور گھی سے محروم ہیں۔ اس کی وجہ ناقابلِ فہم ہے، محکمہ خوراک کے حکام اس سلسلہ میں اس قدر بے حس ہیں کہ انہیں یہاں کے لوگوں کی تکالیف کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ عوامی و سیاسی حلقوں نے محکمہ خوراک سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ بے حسی کو ختم کر کے یہاں کے لوگوں کو گھی کی تقسیم کا فوری طور پر بندوبست کرے۔

مزدوروں کی مشکلات

اس علاقہ کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ کوئلہ کی مختلف کانوں تک جانے کے لئے پختہ سڑکیں نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک تو کان کنوں کو پتھریلے راستوں پر چلنے سے گوناگوں مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے کانوں سے کوئلہ کی لوڈنگ کے سلسلہ میں بے پناہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مکڑوال ایک پتھریلہ علاقہ ہے۔ کوئلہ کی کانوں تک جانے کے لئے بڑی جاں فشانی سے دشوار گزار راستے بنانے پڑتے ہیں۔ پھر کوئلہ کو کانوں سے نکالنے کے لئے جو پیچیدہ ذرائع استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ ان سے کسی وقت بھی جانی نقصان کے ضیاع کا خدشہ رہتا ہے یہاں یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ مکڑوال کالریز میں پی، آئی، ڈی، سی کو منافع کی خاطر اور اپنے کاروبار کو وسیع کرنے کے لئے کسی قسم کی قیمتی مشینری نصب کرنا نہیں پڑی، اور نہ اسے یہاں کثیر زرِ مبادلہ خرچ کرنا پڑا ہے۔ بلکہ بے چارے کان کن ہی ہر قسم کی مشینری کا کام سرانجام دے

رہے ہیں۔ اس کے باوجود پی آئی ڈی سی کو یہاں کے مزدوروں کی بے پناہ دشواریوں کا ذرا بھی خیال نہیں ۔
پی آئی ڈی سی کے اعلیٰ حکام کو چاہیئے کہ وہ مزدوروں اور انتظامیہ پر مزید ظلم ڈھانے کی بجائے فوری طور پر کانوں تک جانے کے لئے پختہ سڑکیں تعمیر کریں، تاکہ مزدور بغیر کسی رکاوٹ کے ملک و قوم کی خوشحالی کے لئے کام کر سکیں۔

کالج کے قیام کی ضرورت

مکڑوال میں اگرچہ پراجیکٹ مینجر سید فراست علی شاہ کی کوششوں سے تعلیمی اور طبّی سہولتوں کا مناسب بندوبست کیا گیا ہے لیکن یہاں اعلیٰ تعلیم کی کوئی سہولت میسر نہیں ہے۔ اس لئے مکڑوال یا اس کے قرب و جوار کے علاقہ میں انٹرمیڈیٹ کالج کا قیام عمل میں لایا جاتے، تاکہ مزدوروں کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں ۔

بقیہ : احوال واقعی

ہے اور وزیر اعظم بھٹو کے حالیہ دورۂ صوبہ سرحد کے دوران اُن پر گولی چلائی گئی تھی" یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ وزیر اعظم بھٹو کا دورۂ سرحد ختم ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا ہے اگر ان پہ گولی چلائی گئی تھی تو ریڈیو کابل یا آل انڈیا ریڈیو نے اسی وقت نشر کیوں نہیں کی، آخر اسے برزنیف کی آمد کی خبر کے ساتھ نشر کرنے میں کیا حکمت کارفرما تھی ۔
سوویت یونین مسٹر برزنیف کے دورۂ بھارت کو خواہ کسی طرح پیش کرے لیکن اس کی کڑیاں روس کے نائب وزیر دفاع اور بھارت کے وزیر خارجہ کے دورۂ کابل سے ملتی ہیں۔ جہاں بعض حلقوں کے مطابق یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ افغانستان، بھارت سے فوجی معاہدے کرے اور اس طرح دونوں ملک پاکستان کے خلاف محاذ کھول دیں ۔

بقیہ باتوں کے خربوزے

کہ کوئی گرمیوں میں اُون کی پبلسٹی کرنے اسکے علاوہ سامعین کی جیب میں ایک گیلن تو درکنار آدھے گیلن پٹرول کے پیسے بھی نہ تھے۔ کیونکہ وہ "باتوں کے خربوزے" کی رونمائی میں شرکت کرنے کے لئے ایک گیلن پٹرول پہلے ہی خرچ کر چکے تھے۔
تقریب کے صدر تھے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، انہوں نے اپنی تقریر میں کہا" مختار زمن کی کتاب خربوزے کا کھیت نہیں، بلکہ زعفران زار ہے۔ اور اس کتاب کے چھپنے کے بعد ان کا شمار صفِ اوّل کے مزاحیہ ادیبوں میں ہوگا ۔ یہ مقام ادیبوں کو رفتہ رفتہ حاصل ہوتا ہے لیکن مختار زمن ایک ہی جست میں اس صف میں شامل ہو گئے۔ جس خوبصورتی سے مختار زمن نے اس کتاب میں طنز و مزاح کے پھول کھلاتے ہیں انسان ان پر صرف ہنستا نہیں بلکہ اس کو رونا آتا ہے"۔ صاحبِ صدر کی یہ بات سن کر ہم نے کتاب کو ہاتھ لگانے کی جرأت تک نہ کی مبادا آنسو ٹپک پڑیں۔ البتہ ٹائیٹل دیکھنے کے گناہگار ضرور ہیں، البتہ ہمیں کتاب کے ناشر حکیم محمد تقی پر ترس آتا ہے جو کتاب شائع کرنے کا کفارہ ادا کرنے کے لئے حج کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔ صاحبِ صدر کی تقریر دلچسپی سے نہ سنی جا سکی کیونکہ چائے کی پیالیوں کی کھنک کانوں میں آنے لگی تھی۔

بقیہ : اداریہ

اقدامات کئے وہ سو فی صد درست ہیں بلکہ ہمارا موقف یہ ہے کہ موجودہ حکومت کا کم از کم تعلیمی اصلاحات کی حد تک کارنامہ عام آدمی کے لئے سود مند ثابت ہوا ہے پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں مفت تعلیم کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ پھر تعلیمی اداروں کو قومیانے سے جہاں تعلیمی وڈیروں کا تسلط ختم ہوا ہے وہاں ان اداروں میں کام کرنے والے لاکھوں اساتذہ کے روزگار کو تحفظ بھی ملا ہے۔ حزب اختلاف کا فرض تھا اور ہے کہ وہ تعلیمی اداروں کی حد تک حکومت کا مثبت محاسبہ کرے۔ جہاں میرٹ کی بنیادوں پر مراعات میسر نہیں، یا نوکر شاہی دھاندلیوں یا بدعنوانیوں کی مرتکب ہو رہی ہے، اسے دور کرانے کیلئے مقدور بھر ذرائع سے کام لے اور ہمیں یقین ہے کہ طلبہ برادری خود بھی اتنی طاقتور ہے کہ وہ ان حرکتوں کا محاسبہ کر سکتی ہے مگر محض کسی ایک بات کو ہنگامہ آرائی کے لئے بنیاد بنانا سود مند ثابت نہیں ہوگا۔
اس کے نتائج جمہوری اداروں کی پامالی کی صورت میں رونما ہو سکتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ خفیہ طاقتیں پھر آمریت کے لئے راستہ ہموار کرنے کی فکر میں ہوں لہٰذا ضرورت ہے کہ مزید کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے مثبت انداز فکر اور عمل سے کام لیا جائے۔
پاکستان میں ایک ایسی حزب اختلاف کی اشد ضرورت ہے جو قوم پرست ہو، جو سیاسی کش مکش کو محض حصول اقتدار تک ہی محدود نہ کرے بلکہ اس کا نصب العین ایک منصفانہ معاشرے کا قیام ہو اور ایک موثر اور فعال متبادل قیادت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی اہل ہو۔ اس وقت حزب اختلاف کا وجود، عدم وجود کے مترادف ہے یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
NOV 29-DEC 6 , 1973